سلسلۂ مطبوعات: مشاہیرِ اُردو

مولانا صلاح الدین احمد

ڈاکٹر طارق ہاشمی

مقتدرہ قومی زبان پاکستان

ا

مولانا صلاح الدین احمد

احوال و آثار

ڈاکٹر طارق ہاشمی

مقتدرہ قومی زبان ☆ پاکستان

۲۰۱۱ء

سلسلہ مطبوعات مقتدرہ: ۵۲۴

عالمی معیاری کتاب نمبر ISBN۹۷۸-۹۶۹-۴۷۴-۲۷۲-۴

☆

طبع اوّل ۲۰۱۱ء

تعداد ۵۰۰

قیمت ۱۱۰روپے

فنی تدوین .... ڈاکٹر راشد حمید

ترتیب وصفحہ بندی .... منظور احمد

پروف خوانی .... حاجی غلام مہدی

طابع .... ایس ٹی پرنٹرز، راولپنڈی

اہتمام .... تجمل شاہ

ناشر .... **افتخار عارف**

صدر نشین

مقتدرہ قومی زبان، ایوانِ اُردو،

پطرس بخاری روڈ، ایچ۔۸/۴،

اسلام آباد، پاکستان۔

فون: ۰۵۱-۹۲۵۰۳۱۱-۱۳

فیکس: ۰۵۱-۹۲۵۰۳۱۰

☆

پیش لفظ

مقتدرہ قومی زبان نے ادارے کے دوسرے اہم وظائف کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اُردو کے بنیاد گزاروں کو یاد رکھا جانا چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں کو اُن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات سے آگاہ کیا جا سکے۔ مشاہیر اُردو کے عنوان سے پیش نظر سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا گیا ہے جس میں اُردو کے محسنوں اور بنیاد گزاروں کی اُردو کے لیے خدمات پر تعارفی نوعیت کی مختصر مگر جامع کتابیں شائع کی جائیں گی۔ اس منصوبے کے تحت مختلف شخصیات پر تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے وقیع کتابیں مرحلہ وار اشاعت پذیر ہوں گی۔

مولانا صلاح الدین احمد اردو کے ایک معتبر تنقید نگار، عہد ساز مدیر، بہت نمایاں مقام و مرتبے کے حامل مترجم، تبصرہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ادبی دنیا جیسے ادبی جریدے کے مدیر کی حیثیت سے اردو دنیا میں مولانا صلاح الدین احمد ممتاز اور منفرد مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے مولانا کا اسلوب بالکل جداگانہ اور الگ تشخص کا حامل ہے۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق جیسی تحریکوں سے طویل وابستگی ان کی شخصیت کا ایک بہت ہی نمایاں پہلو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی خدمت کے حوالوں سے مولانا صلاح الدین احمد بے حد اہم ادیب اور دانش ور ہیں۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی اردو کے نوجوان محقق، تنقید نگار، شاعر اور استاد ہیں۔ انھوں نے مقتدرہ قومی زبان کے سلسلہء مطبوعات مشاہیر اردو کے لیے ہماری درخواست پر مولانا صلاح الدین احمد کے احوال و آثار کے حوالے سے بہت اہم کتاب لکھی اور اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر طارق ہاشمی کی یہ کتاب مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت اور خدمات کو صحیح تناظر میں سمجھنے میں معاون اور مددگار ہوگی۔

——— افتخار عارف

دیباچہ

مولانا صلاح الدین احمد نے ایک بھرپور زندگی گزاری، یقیناً وہ اُن تمام معمولات کے تجربے سے گزرے ہوں گے، جن سے ایک زندہ انسان کو گزرنا ہوتا ہے مگر اُن کے ہاتھ میں ایک تسبیح ضرور تھی جس کے دانوں پر وہ اُردو کا وِرد کرتے رہتے تھے اور ہمہ وقت اِس زبان کی سلامتی کا وظیفہ پڑھتے رہتے۔ اُردو کے لیے مولانا صاحب نے دُعا بھی کی مگر اِس زبان کی خدمت کے لیے زندگی بھر کام بھی کیا اور جہاں کہیں کوئی معرکہ درپیش ہوا، وہیں سینہ سپر ہو گئے اور ایک ادیب سے زیادہ مجاہد کے رُوپ میں ظاہر ہوئے۔

مُلک تقسیم ہوا اور اُن کا گھر نذرِ آتش مگر اُردو کے معاملے پر نہ تو اُن کا ذہن بٹا، نہ اُس جوئے کوشاں کی روانی میں کمی آئی جو کشتِ اُردو کی سیرابی کے لیے موجزن تھی۔ گھر کو جلتا دیکھ رہے تھے مگر آنکھیں صرف اُردو کے لیے نم دیدہ تھیں۔

''اُردو بولو تحریک''، ''ادبی دُنیا''، ''اسلامک لٹریچر کمپنی'' اور ''اکادمی پنجاب'' یہ وہ سب وسائل ہیں جو مولانا صاحب خدمتِ اُردو کے لیے بروئے کار لاتے رہے۔ یہ بات دِل نشیں رہے کہ مذکورہ وسائل انھوں نے خود ہی پیدا کیے اور اِس کے لیے کبھی اپنے اسبابِ ذاتی کے زیاں کی پروا نہیں کی۔

مولانا صلاح الدین احمد نے مسلسل لکھا۔ اُردو کی حمایت میں بھی اور اُردو کے تخلیقی اَدب کی حوصلہ افزائی کی خاطر بھی۔ اُردو کے افسانوی ادب نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا اور مولانا صاحب نے اپنی مشفق تنقید کے ہاتھ سے اُنگلی پکڑ لی۔ ''ادبی دُنیا'' کے اِداریوں اور

مضامین کے ذریعے نئے افسانہ نگاروں کی خوب حوصلہ افزائی کی۔ دوسری طرف فکرِ اقبال کے مختلف زاویوں اور جہات پر پُر مغز مقالے رقم کیے۔ دلچسپ اَمر ہے کہ زبان کا پیرایہ ایسا اختیار کیا کہ محمد حسین آزاد کا رنگِ انشا جگمگا اُٹھا۔ ایسی رواں اور پر بہار نثر لکھی کہ روشنی اور مٹھاس قاری نے بیک وقت محسوس کی۔

مولانا صلاح الدین احمد پر میری یہ کاوش ایک تسلسل کا حصہ ہے۔ اِس سے قبل ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، عاتکہ صدیقی اور محمود احمد اسیر کی کتب مولانا صاحب کی ذات اور علمی خدمات پر بہت عمدہ تحقیقی و تنقیدی مواد فراہم کرتی ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں نے اپنی کتاب کے مندرجات کی تکمیل کے لیے مذکورہ کتب سے اِستفادہ کیا ہے۔ میری کتاب کی انفرادیت صرف یہ ہے کہ یہ مقتدرہ قومی زبان کی ''مشاہیرِ اُردو'' کی اُس سلسلے کا حصہ ہے جس میں خادمینِ اُردو کی متنوع کوششوں کی ایک جامع انداز میں دستاویز بندی کی گئی ہے اور میں نے بھی اِدارے کے اِس مطمحِ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے مولانا صاحب کے کوائفِ ذاتی و ادبی نیز اُردو کے لیے اُن کے جہادِ مسلسل کی داستانِ مفصل کو مختصر اور جامع اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد پر کتاب لکھنے کا تجربہ میرے ایمان کے اِستحکام کا ذریعہ بھی ثابت ہوا ہے کہ زندگی پیدائش اور موت کے مابین محض کوئی زمانی وقفہ نہیں بلکہ تخلیقی تحرک کے ذریعے دوام پا جانے کا نام ہے۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی

فہرست

☆☆☆☆

پہلا باب

مولانا صلاح الدین احمد ـــــ سوانحی کوائف

خاندانی پس منظر

مولانا صلاح الدین احمد کا علمی پیش منظر جس قدر روشن اور واضح ہے، اُن کے خاندانی پس منظر پر اِتنے ہی دُھندلکوں کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ویسے بھی جن کی شاخِ حیات تہذیبی طور پر ثمر بار ہو وہ اپنے شجرۂ نسب پر افتخار کے اِبتلا کا شکار نہیں ہوتے اور یہی صورت مولانا صلاح الدین احمد کی تھی۔

اِس سلسلے میں اہلِ تحقیق جہاں تک آ گاہی حاصل کر سکے ہیں، اُن کے خاندانی پس منظر میں یہ بات قابلِ ذِکر ہے کہ:

> ''مولانا کے دادا ایک آسودہ حال ہندو راج پوت چوہان خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ راج پوتانہ کی کسی ریاست میں میر منشی کے عہدے پر فائز تھے۔ مالی و انتظامی امور پر دسترس رکھنے کی بنا پر انھیں ریاست میں مقامِ امتیاز حاصل تھا۔''(۱)

اُن کی صلاحیتوں کی شہرت کے باعث جموں و کشمیر کے راجہ نے انھیں ریاست کے مالی امور کو سنبھالا دینے کے لیے اپنے دربار میں اعلیٰ عہدے پر فائز کیا مگر اُن کی یہ ہجرت خود اُن کے باطن میں ایک عظیم تبدیلی کا باعث بن گئی۔ سری نگر میں درگاہ نورالدین ولی واقع چرار شریف میں اُن کی ملاقات بعض مسلمان بزرگوں سے ہوئی اور وہ درگاہ کے خلیفہ کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہو

کر ''رام سنگھ چوہان'' سے ''حسین بخش'' کے نام سے موسوم ہوئے اور اپنے بیٹے کو ''احمد بخش'' کا نام دیا۔

حسین بخش نے مذہب کی تبدیلی کو محض عقائد یا رسوم کی تبدیلی کے طور پر اختیار نہیں کیا بلکہ اپنے عقیدۂ نو کے ساتھ رُوحانی صدق کے ساتھ وابستگی اختیار کرتے ہوئے اپنی اولاد کو تہذیبی ورثے سے ثروت مند کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ ایک ہندو گھرانے میں آنکھ کھولنے والے رام سنگھ چوہان کے فرزند احمد بخش عربی و فارسی کے اُستاد اور بعد ازاں دینیات اور فارسی کے پروفیسر بن گئے۔ اُن کے تدریسی کیریئر میں چیفس کالج اور گورنمنٹ کالج، لاہور جیسے عظیم تعلیمی اداروں سے وابستگی نمایاں ہے۔

یہاں ایک حکایت دلچسپی کی حامل ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی درسی کتاب ''اُردو کی پہلی کتاب'' میں ایک سبق ''مولوی صاحب کا گھوڑا'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ [۲] بقول سیّد علی عباس جلال پوری، مولانا صلاح الدین احمد کہا کرتے تھے کہ:

> ''آزاد نے مولوی صاحب کا گھوڑا میں والدِ مرحوم کا ہی ذِکر کیا ہے۔'' [۳]

غلام رسول ازہر [۴] اور حکیم عبدالمجید عتیقی [۵] بھی اِسی روایت کے موئید ہیں لیکن آزاد کے نواسے آغا محمد باقر نے داخلی شواہد کی بنا پر اِس روایت کو ردّ کیا ہے۔ اُن کے مطابق:

> ''مولانا صلاح الدین احمد صاحب کے والدِ مرحوم کی پیدائش ۱۸۶۵ء کی ہے اور یہ سبق ۱۸۶۷ء میں لکھا گیا۔ چونکہ مولانا صلاح الدین احمد کے والد اِس سج دھج سے گھوڑے پر چیفس کالج میں پڑھانے جایا کرتے تھے، اِس لیے بعض لوگوں کو اِشتباہ ہو گیا۔'' [۶]

بعض دیگر روایات کے مطابق اِس کہانی کے ہیرو خود محمد حسین آزاد ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخ میں لکھا ہے:

> "He ware a choga, one sleeve of which he kept out of use and slung at his back, and a pony

which he had for riding, never ridden in my presence, always followed him. This was the "MOULVI SAHIB KA GHORA" is this primer."(7)

مولوی صاحب کا گھوڑا مولانا آزاد کا خاکہ ہے یا مولوی احمد بخش کا، یہ ایک متنازعہ اَمر ہے لیکن اِس بات پر بہر حال اتفاق ہے کہ دونوں صاحبان کالج آنے کے لیے ایک محتشم اسلوب اختیار کرتے تھے۔

مولوی احمد بخش باطنی اعتبار سے نہایت شفاف کردار کے مالک تھے۔ اُن کی ایمان داری کا ایک واقعہ غلام رسول ازہر نقل کرتے ہیں، جو انھیں مولانا صلاح الدین نے بیان کیا:

''مولوی احمد بخش (مولانا کے والد) اپنے والدِ مرحوم کے کاغذات اور پرانی کتابیں دیکھ رہے تھے کہ کاغذات سے پتا چلا کہ سیال کوٹ میں ایک گوشت والے کے انھیں ایک روپیہ دو آنے دینے ہیں۔ چناں چہ اس پرچے کو پڑھ کر مولوی احمد بخش صاحب نے اس وقت لاہور سے سیال کوٹ کا سفر اختیار کیا۔ سیال کوٹ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ گوشت فروش تو مر چکا ہے۔ پھر بھی مولوی احمد بخش نے اپنے والدِ مرحوم کے ذمے واجب الادا رقم (ایک روپیہ دو آنے) گوشت فروش کے وارثان کو ادا کر دی۔''(۸)

مولانا صلاح الدین احمد، مولوی احمد بخش کی دوسری بیوی بلند اختر بیگم کے بطن سے پیدا سے ہوئے۔ اُن کی پہلی زوجہ کا انتقال ہو گیا تھا، جس سے اُن کے دو بچے فیروز الدین احمد اور ڈاکٹر سراج الدین احمد ہیں۔ بلند اختر بیگم سے اُن کے ہاں پانچ اولادیں ہوئیں۔ دو بیٹے ضیاء الدین احمد اور صلاح الدین احمد جب کہ تین بیٹیاں شمسہ اختر، اقبال اختر اور روشن اختر ہیں۔

یہاں یہ اَمر قابلِ ذکر ہے کہ صلاح الدین احمد مولوی احمد بخش کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔

مولوی احمد بخش کی طرح اُن کی اہلیہ بھی نہ صرف صاحبِ کردار خاتون تھیں بلکہ پیکرِ ایثار بھی تھیں۔ مولوی صاحب تو ایک روپیہ دو آنے قرض کا لوٹانے سیال کوٹ پہنچ گئے مگر بلند اختر کی

فیاضی اور بلند حوصلگی ملاحظہ ہو کہ جب جنگِ طرابلس چھڑی اور ہندوستان میں چندہ جمع کرنے کی مہمیں شروع ہوئیں تو انھوں نے اپنا سب کچھ اِس راہِ ایثار میں دینے کا فیصلہ کیا۔ الطاف حسین قریشی کو مولانا صلاح الدین احمد بتاتے ہیں:

''والدہ صاحبہ بھی اپنے سینے میں ایک حساس اور دردمند دِل رکھتی تھیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب طرابلس کی جنگ شروع ہوئی اور مظلوم مسلمانوں کی اعانت کے لیے ہندوستان میں چندہ جمع کرنے کی تحریکیں اُٹھیں تو والدہ صاحبہ نے اپنا سب کچھ (جس میں زیور بھی شامل تھا) چندے میں دے دیا۔ ان واقعات نے میرے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے، ایسے اثرات جنھوں نے زندگی کا رُک کسی اور ہی طرف پھیر دیا، اپنے والدین کی قومی معاملات میں گہری دل چسپی اور لگاؤ میرے لیے مشعلِ راہ رہتا اور میں نے اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کا اس وقت فیصلہ کر لیا تھا جب ابھی میرا شعور کچھ زیادہ پختہ نہیں تھا۔''(۹)

ایثار و قربانی کا یہ جذبہ اُن کے والد میں بھی کچھ کم نہ تھا۔ سرسیّد جب چندہ مہم کے سلسلے میں پنجاب آئے تو مولوی احمد بخش نے دِل کھول کر اپنا حصہ شامل کیا حتیٰ کہ جو رقم پس انداز کر رکھی تھی وہ بھی لٹا دی۔

ایثار و سخاوت کا یہ سلسلہ دراز ہوتا ہے تو اُن کے معصوم بچوں کی مٹھی بھی بند نہیں رہتی۔ پروفیسر حمید احمد خان لکھتے ہیں:

''۱۹۱۲ء میں جنگِ طرابلس چھڑی تو لاہور میں چندہ کی مہم شروع کی گئی۔ اُن دِنوں موچی دروازے کے باہر معرکہ آرا جلسے ہوا کرتے تھے۔ ایک جلسے میں مولانا ظفر علی خاں نے ایک نو سال کے بچے کو ہاتھوں سے اُوپر اُٹھا کر حاضرین سے کہا ''جنگِ طرابلس کے سلسلے میں سب سے زیادہ

چندہ اِس باحمیت بچے نے اکٹھا کیا ہے اور وہ بچہ یہ ہے۔'' شاید آپ کو اِس بات کا علم نہ ہو کہ وہ نو سال کا بچہ صلاح الدین تھا، جو بڑا ہو کر مولانا صلاح الدین کہلایا۔''(۱۰)

ولادت

مولانا صلاح الدین احمد کی تاریخِ ولادت ۲۵ مارچ ۱۹۰۲ء بروز منگل بیان کی جاتی ہے۔(۱۱) اِس سلسلے میں عاتکہ صدیقی نے اپنے تحقیقی مقالے کے ایک حاشیے میں لکھا ہے:

''مولانا کے اپنے بیان کے مطابق ان کا سنہ پیدائش ۱۹۰۲ء ہے۔ دیکھیے ''ملاقاتیں'' الطاف حسن قریشی، ص ۱۳۷۔ لیکن اُن کی تاریخِ ولادت کی کوئی مستند تحریری شہادت نہیں مِل سکی۔ ۲۵ مارچ کی تاریخ اُن کے صاحبزادے معزالدین احمد سے معلوم ہوئی ہے جو اُنھیں زبانی یاد ہے۔ جنتری کے مطابق اس تاریخ کو منگل کا دِن، ۱۵۔ ماہ ذی الحجہ اور ۱۳۱۹ ہجری کا سال نکلتا ہے۔ (دیکھیے تقویم ہجری و عیسوی (ابوالنصر محمد خالدی)، شائع کردہ انجمن ترقی اُردو دہلی، ۱۹۳۹ء)''(۱۲)

گمٹی بازار سے آگے سیّد مٹھا بازار کو جاتے ہوئے ایک چھوٹی سی گلی جس کا نام ہنومان مندر کی نسبت سے کوچہ ہنومان مشہور تھا (موجودہ نام کوچہ نخاروقیہ ہے) میں اُن کے دادا حسین بخش نے ایک مکان خریدا تھا۔ یہی مکان مولانا صلاح الدین احمد کی جائے پیدائش ہے۔ اِس مکان کے درودیوار کو مولانا صاحب کی نسبت کے علاوہ بعض دیگر تاریخی ادبی شخصیات سے تعلق کا بھی اعزاز حاصل ہے۔

سر شیخ عبدالقادر اِن سعادتوں کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

''جس زمانے میں میر غلام بھیک نیرنگ، لا کالج میں پڑھتے تھے تو اسی مکان میں رہتے تھے۔ میر صاحب مولوی ضیاالدین کے بڑے دوست

تھے۔ اقبال مرحوم اور میں اکثر ان سے ملنے یہاں آیا کرتے تھے۔
ہمارے ایک دوست کدار ناتھ چوپڑہ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ مولوی
ضیاالدین اور میر نیرنگ کو کسرت سے بہت شوق تھا، اس کونے میں ایک
اکھاڑہ بھی انھوں نے بنا رکھا تھا۔ جہاں کشتی لڑتے تھے۔ کبھی کبھی اقبال
مرحوم کو شوق آتا تو وہ بھی لنگوٹ باندھ کر اکھاڑے میں اُترتے اور
میر صاحب کے ساتھ ان کا دنگل بڑا لطف دیتا پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کر
کہنے لگے۔ یہ مکان ایک تاریخی یادگار ہے جسے محفوظ کر لینا چاہیے۔''(۱۳)

تاریخ کی کئی ایک عظیم ہستیوں کی طرح مولانا صلاح الدین کی زندگی میں بھی یہ بات قابلِ ذِکر ہے کہ انھیں اپنے والدِ محترم کا سایۂ عاطفت زیادہ دیر تک میسر نہ آ سکا اور وہ اُس وقت انتقال کر گئے جب مولانا صلاح الدین کی عمر صرف چار برس کی تھی لیکن یہ اَمر باعثِ اطمینان ہے کہ اُن کی زندگی میں وہ احساسِ محرومی نہیں ہے جو ایک یتیم کے دِل میں جاگزیں ہوتا ہے، جس کی وجہ اُن کے برادرِ شفیق ضیاءالدین احمد ہیں جنھوں نے اُن کی سرپرستی اور تعلیم کے سلسلے میں والد ایسا کردار ادا کیا اور ایک بڑے بھائی کہ ذمہ داریوں کو نہایت احسن طریقے سے نبھایا۔

تعلیم

اِبتدائی عمر میں درسِ قرآن کے لیے مولانا بھاٹی دروازے کے اندر واقع اُونچی مسجد جانے لگے۔ بعدازاں ۱۹۱۰ء میں انجمنِ حمایت اسلام کے زیرِ اِنتظام اسلامیہ ہائی سکول میں چوتھی جماعت میں داخل کیا گیا۔ اِبتدائی تین جماعتیں انھوں نے گھر پر ہی پڑھیں۔

یہاں یہ امر قابلِ ذِکر ہے کہ جس طرح اُن کا خاندانی پس منظر واضح نہیں۔ اُسی طرح اُن کے تعلیمی مدارج کی تفصیل بھی زیادہ معلوم نہیں ہو سکی۔ جس کی وجہ آتش زدگی کا وہ واقعہ ہے جو تقسیمِ ہند کے وقت فسادات کے دوران میں پیش آیا۔ اِس میں اُن کا مکان اور کتب خانہ دونوں جلا دیئے گئے۔ اِسی سلسلے میں محمود احمد اسیر نے اپنے مقالے میں لکھا ہے:

''اگر تقسیمِ ہندوپاک میں مولانا صلاح الدین احمد کا مسکن اور کتب خانہ نذرِ آتش نہ ہوتا تو اُن کی اسناد سے اُن کے تعلیمی مدارج کے صحیح سالوں کا تعین ہوسکتا تھا۔ تاہم مولانا صلاح الدین کے خاندان والوں کا بیان ہے کہ انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں میٹرک کیا تھا۔ مولانا ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اِس حساب سے مڈل کے لیے ۱۹۱۵ء اور میٹرک کے لیے ۱۹۱۷ء کو صحیح خیال کرنا چاہیے۔''(۱۴)

مولانا صلاح الدین احمد نے ایف اے کا امتحان ۱۹۱۷ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے پاس کیا، جس کے بعد انھوں نے سناتن دھرم کالج میں بی اے کے لیے داخلہ لیا لیکن اُن دِنوں جلیانوالہ باغ کے سانحے ، مارشل لا کے نفاذ ،مختلف شہروں میں ہوائی جہازوں کے ذریعے بم باری، آرمڈ ٹرینوں کے ذریعے فائرنگ اور معصوم لوگوں کو ناروا سزائیں دینے کے خلاف تحریک ِعدم تعاون جسے تحریکِ ترکِ موالات بھی کہا جاتا ہے شروع ہوئی، جس کے باعث صلاح الدین احمد نے سناتن دھرم کالج کو خیر باد کہا اور بعد ازاں ہندوستان کی قومی یونیورسٹی کی لاہور میں ایک شاخ جو بریڈ ہال میں قائم ہوئی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔

شادی

مولانا صلاح الدین احمد کی شادی شیخ محمد ابراہیم کی صاحبزادی بلقیس سے ہوئی۔ اُن کا سسرالی خاندان ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دِلّی سے لاہور آ کر آباد ہو گیا تھا۔ مولانا کی شادی کی سلسلے میں عاتکہ صدیقی نے لکھا ہے:

''سکول کے زمانے ہی میں مولانا کی منگنی ہوگئی تھی۔ لڑکی کا نام بلقیس تھا جو اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اُن لوگوں کی مولانا سے عزیز داری بھی تھی۔ بی اے کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد ۱۹۲۲ء میں اُن کی شادی ہو گئی۔''(۱۵)

اُن کے آنگن میں چھے پھول کھلے۔ تین بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹوں کے نام وجیہہ الدین احمد، معزالدین احمد اور فصیح الدین احمد ہیں، جب کہ بیٹیوں کے نام صبیحہ جیلانی، سہیلہ اور ریحانہ بانو ہیں۔

مولانا کی اولاد کے سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ معروف قانون دان اور حقوقِ اِنسانی کی علمبردار محترمہ حنا جیلانی اور عاصمہ جہانگیر اُن کی نواسیاں ہیں جو اُن کی صاحبزادی صبیحہ جیلانی کی بیٹیاں ہیں۔

روزگار

اہلِ ادب کا اصل روزگار تو مزدوریٔ قلم ہوتی ہے، جس سے حاصل شدہ اُجرت سے وہ رُوح کو رزقِ بہم پہنچاتے ہیں، تاہم تن کی بقا اور دیگر سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے مولانا صلاح الدین احمد نے روزگار کے جن وسائل سے اِستفادہ کیا، اُن کی تفصیل انور سدید نے یوں دی ہے:

> ''۲۹۔۱۹۲۸ء میں ایس احمد اینڈ کمپنی قائم کی جو ڈاک کے ذریعے دیسی مصنوعات کی فروخت بیرونِ ملک کرتی تھی۔ اندرونِ ملک اشیاء فراہم کرنے کا کام بھی یہ کمپنی سرانجام دیتی تھی۔
>
> ۳۱۔۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ایڈورٹائزنگ ایکسپریس کمپنی اور پبلسٹی لمیٹڈ کے نام سے ادارے قائم کیے جو اشتہارات کا کام کرتے تھے۔
>
> آزادی کے بعد کچھ عرصے کے لیے نمک برآمد کا کام بھی کرتے رہے۔ اس کمپنی کا نام حمید آغا اینڈ کمپنی تھا۔ حمید اختر اور وزیر آغا ان کے شریک کار تھے۔
>
> زندگی کے آخری ایام میں گزراوقات فرینکلن اور دوسرے اِداروں کے تراجم اور ریڈیو کی نشریات کے معاوضے پر ہوتی تھی۔

مولانا صلاح الدین احمد سرکاری نوکری پسند نہ کرتے تھے۔ان کے برادرِ
بزرگ ضیاء الدین احمد بمبئیٔ پولیس میں ایس پی تھے۔انھوں نے مولانا
صلاح الدین کی نامزدگی بطور ڈی ایس پی کرائی لیکن انھوں نے یہ پیش
کش قبول نہ کی۔''(۱۷)

اِس تفصیل میں اضافہ صرف اِس قدر ہے کہ اِبتدائی دِنوں میں مولانا صاحب نے دیوان سنگھ مفتون کے اخبار ''پنتھ'' میں بھی کام کیا اور ایک کپڑے کے کارخانے میں ملازمت بھی لیکن خرابیٔ صحت کے باعث بہت جلد چھوڑ دی۔''خیالستان'' کے اخراجات پورا کرنے کے لیے وہ ایک ہندو اخبار ''انصاف'' میں بھی کام کرتے رہے۔

قائم کردہ اِدارے اور ''ادبی دُنیا''

مولانا صرف صاحبِ علم نہ تھے بلکہ اُن کی زندگی میں عمل کی بھی فراوانی نظر آتی ہے۔ اِسی سلسلے میں اُن کے زیرِ انتظام بعض اِداروں کا ذِکر ناگزیر ہے۔

i۔اسلامک لٹریچر کمپنی

یہ اِدارہ انھوں نے ۲۷۔۱۹۲۶ء میں قائم کیا، جس نے مسلمان رہنماؤں کی تصویروں پر مشتمل ایک ''اسلامی البم'' شائع کیا۔ نبی کریم ﷺ کی ایک سوانح عمری فرانس سے منگوا کر ہندوستان میں تقسیم کی۔

ii۔اکادمی پنجاب

یہ اِدارہ ۱۹۵۰ء میں قائم کیا گیا، جس کا بنیادی مقصد اہلِ قلم کی فلاح تھا۔ اکادمی پنجاب محض ایک اِدارہ ہی نہ تھا بلکہ ایک خواب تھا، جس کی تعبیر کی تلاش کے لیے انھوں نے اپنے مال واسباب کی بھی قربانی دی۔عاتکہ صدیقی لکھتی ہیں:

''اکادمی پنجاب کا قیام مولانا کی اُردو ادب سے والہانہ محبت کا نتیجہ تھا اور
یہ اُن کے اُس خواب کی عملی صورت تھی جس کا آغاز ''خیالستان'' کے اجرا

سے ہوا تھا۔ مولانا نے اُردو کی خاطر زندگی کی تمام آسائشوں سے محروم ہونا گوارا کرلیا تھا۔ اس سے بڑی قربانی اور کیا ہوسکتی ہے کہ فروغِ ادب و زبان کے لیے اپنی جائیداد بیچ کر ''اکادمی پنجاب'' پر لگا دی۔ اکادمی پنجاب یا اُردو فاؤنڈیشن (۹۲)، مولانا کا حسین ترین خواب ایک ایسے ادارۂ تالیف وتصنیف کی غمازی کرتا تھا جو مصنّفین کے لیے تالیف، مطالعہ، تحقیق، تفریح، سکونت اور آسودگی کے بیشتر لوازم مہیا کر سکنے کے قابل ہوتا۔ اس کی تکمیل کے لیے مولانا مئی ۱۹۵۰ء سے تن تنہا مصروف تھے۔ اُن کے خوابوں کی تعبیر کا ایک حصہ اکادمی کی مطبوعات کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔''(۱۸)

عاتکہ صدیقی نے اکادمی کی جن مطبوعات کی طرف اِشارہ کیا ہے۔ اُن کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو:

ڈاکٹر وزیر آغا	خیال پارے
وزیر آغا	اُردو ادب میں طنز و مزاح
میراجی	مشرق و مغرب کے نغمے
وزیر آغا	مسرت کی تلاش
مولانا حالؔی	حیاتِ جاوید
داؤد رہبر	نسخہ ہائے وفا
شمس آغا	اندھیرے کے جگنو
کرشن چندر	نظارے
عباس بیگ محشؔر	نگاہِ فطرت
محمد علی ردولوی	گویا دبستان کھل گیا

اثر صہبائی	بامِ رفعت
وزیر آغا (مرتبہ)	۱۹۵۸ء کی بہترین نظمیں
وزیر آغا (مرتبہ)	۱۹۵۹ء کی بہترین نظمیں
وزیر آغا (مرتبہ)	۱۹۶۰ء کی بہترین نظمیں
وزیر آغا (مرتبہ)	۱۹۶۱ء کی بہترین نظمیں
مصطفیٰ خان شیفتہ	دیوانِ شیفتہ
عصمت چغتائی	کلیاں
ڈاکٹر وزیر آغا	نظمِ جدید کی کروٹیں
ہاشمی فرید آبادی	غازیانِ تہذیب
عبدالمجید سالک	انڈونیشیا اور اس کے لوگ
ابرار صدیقی	بچوں کی ذہنی صلاحیتیں

iii۔ادبی دُنیا

یہ رسالہ تاجور نجیب آبادی نے لاہور سے مئی ۱۹۲۹ء جاری کیا۔ وہ اس کے مدیرِ اعلیٰ تھے۔ جب کہ حنیف ہاشمی بطور مدیر خدمات سرانجام دیتے تھے۔ بعدازاں حامد انصاری اور میلا رام نے مجلسِ ادارت میں شمولیت اختیار کی۔ اِس رسالے کے نگران شیخ عبدالقادر تھے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے ادبی دُنیا اپریل ۱۹۳۳ء میں خریدا، اور اِس کی ادارت منصور احمد کو سونپی۔ جنوری ۱۹۳۴ء سے مولانا صلاح الدین احمد کا نام بطور ناشر شائع ہونا شروع ہوا۔

''۱۹۳۷ء میں منصور احمد فوت ہو گئے۔ جون ۱۹۳۷ء سے ''ادبی دُنیا'' کی ادارت عاشق حسین بٹالوی اور حفیظ ہوشیار پوری کو سونپی گئی۔ جنوری ۱۹۳۸ء سے اِدارے میں مولانا صلاح الدین احمد کا نام بھی شامل کر لیا گیا۔

۱۹۳۹ء میں ''ادبی دُنیا'' کی ادارت مولانا صلاح الدین احمد اور میراجی نے سنبھال لی۔

۱۹۴۲ء میں قیوم نظر ''ادبی دُنیا'' میں بطور آنریری جائنٹ ایڈیٹر شامل ہوئے اور میراجی دہلی چلے گئے ''ادبی دُنیا'' میں قیوم نظر کا قیام بھی بہت مختصر ثابت ہوا۔ اور جولائی ۱۹۴۳ء کے بعد مولانا صلاح الدین احمد نے ادارت کے فرائض خود ہی سرانجام دیئے۔

۱۹۴۷ء فرقہ وارانہ فسادات میں مولانا صلاح الدین احمد کا کتب خانہ جلا دیا گیا۔

۱۹۴۸ میں ''ادبی دُنیا'' کا دورِ جدید شروع ہوا اور پرچے کی ضخامت دوسو صفحات کر دی گئی۔

۱۹۵۲ء میں ''ادبی دُنیا'' سابقہ سو صفحات کے لگ بھگ ضخامت میں چھپنے لگا۔

۱۹۶۰ء میں ''ادبی دُنیا'' کا پانچواں دور شروع ہوا۔ ضخامت تین صد صفحات سے زائد اور قیمت صرف ایک روپیہ کر دی گئی۔ حصۂ نظم کے مدیر ڈاکٹر وزیر آغا مقرر ہوئے۔

۱۹۶۴ء میں مولانا صلاح الدین احمد وفات پا گئے۔ دورِ پنجم میں ۱۲ ضخیم شمارے شائع ہوئے۔

۱۹۶۵ء میں حامد علی خان نے مولانا صلاح الدین احمد کا ''یادگار نمبر'' شائع کیا۔ مولانا مرحوم کے صاحب زادے فصیح الدین احمد مینجنگ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ''ادبی دُنیا'' کی ادارت محمد عبداللہ قریشی صاحب کو تفویض ہوئی۔

اپریل ۱۹۷۴ء کو ''ادبی دُنیا'' بند ہو گیا۔

بیرونِ ملک سفر

جون ۱۹۶۲ء میں مولانا صلاح الدین احمد ایک مجلسِ مذاکرہ میں شرکت کی غرض سے

امریکہ گئے۔ جزائر ہوائی میں ایک ہفتہ قیام کیا وہاں انھوں نے مغربی پاکستان میں اُردو کی اہمیت کے موضوع پر تقریر کی۔ ہوائی کے بعد جاپان گئے اور ٹوکیو میں قیام کیا۔

ادبی سفر کی اِبتدا

مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ''خیالستان'' کے اجرا سے ہوتا ہے، جس میں اُن کی اوّلین تحریریں شائع ہوئیں۔ اِس سلسلے میں قابلِ ذِکر تحریریں ''شمعِ زندگی''، ''تہذیب قبل از تاریخ'' اور ''شیکسپیئر'' ہیں۔

مولانا اِبتدا میں شعر بھی کہتے تھے۔ غزل میں تخلص 'ثنا' کرتے تھے مگر یہ اَمر بھی مصدقہ نہیں۔ اُن کا شعری سفر محض تسلی ذوق تھا اور بعد میں اُن کی پہچان کا نشان بھی شاعری کے بجائے نثر قرار پایا۔ وہ اپنے شعروں کو بھی ڈائری کی حد تک رکھتے تھے اور کسی پر اپنا شاعر ہونا ظاہر نہیں کرتے تھے۔ غلام رسول ازہر لکھتے ہیں:

> ''مولانا ۱۹۳۵ء میں ماڈل ٹاؤن میں رہتے تھے۔ وجیہہ صاحب (مولانا کے بڑے صاحب زادے) اُن دِنوں چھٹی ساتویں جماعت میں تھے، تو ان کے ہاتھ ایک بوسیدہ سی بیاض لگی جس کے ایک طرف داغ اور امیر مینائی وغیرہ کے کچھ اشعار درج تھے اور دوسری طرف کچھ مسلسل غزلیں تھیں، جن میں ثنا تخلص آیا تھا۔ جب وجیہہ صاحب نے مولانا سے کہا کہ یہ ثنا کون ہیں تو فرمایا ''بیٹے! یہ بھی کوئی شاعر تھا۔'' اور بقول وجیہہ صاحب پھر شاعر کا عقدہ ایک مرتبہ یوں کھلا کہ اس میں ایک شعر وجیہہ صاحب کی والدہ کے لیے کہا گیا تھا جس میں ثنا تخلص تھا۔ اور یہ کہ جب مولانا صلاح الدین احمد کے بڑے بھائی ضیاءالدین احمد نے وہ شعر اپنی بیوی کے لیے ثنا کو ضیا کر کے پڑھا تو لفظ ضیا شعر کے مفہوم میں کھپتا نہ تھا اور بات نہیں بنتی تھی۔''(۱۷)

اسناد و اعزاز

اِسے مولانا صلاح الدین احمد کا استغنا کہا جائے کہ ناقدری زمانہ کہ اُن کی زندگی میں اُنھیں کسی نوع کے اعزاز سے نہیں نوازا گیا۔ لیکن بعد از وفات دو اعزاز قابلِ ذکر ہیں۔

i۔ اربابِ اُردو پاکستان کی طرف سے بی این آر آڈیٹوریم لاہور میں ۲/ اگست ۱۹۶۲ء مولانا کی خدمات کے اعتراف میں مولانا حامد علی خاں کی زیرِ صدارت ایک اجلاس میں انھیں ''ناخدائے اُردو'' کا خطاب دیا گیا اور اِس اعزاز کی سند اُن کے چھوٹے بیٹے فصیح الدین احمد کو دی گئی۔

ii۔ ۱۴/ اگست ۱۹۶۴ء کو یومِ آزادی کے موقعے پر مولانا صلاح الدین احمد کو اُردو ادب کے لیے شاندار خدمات پر اعلیٰ کارکردگی کا صدارتی سٹرٹیفکیٹ اور دس ہزار روپے نقد پیش کیے گئے جو اُن کے فرزند نے وصول کیے۔

وفات

مولانا صلاح الدین نے ساری زندگی اُردو کی خدمت کی۔ یہ اَمر اُردو سے اُن کی محبت کا ثبوت اور حیران کن تسلسل ہے کہ اُن کی زندگی کے آخری لمحات بھی اُردو کی خدمت میں بسر ہوئے۔ ۱۴ جون ۱۹۶۴ء کو ساہیوال سے ۳۵ میل دُور قبولے (عارف والا) میں رانا ظفر اللہ کی دعوت پر مولانا صلاح الدین جامعہ اسلامیہ کے سالانہ جلسے کے سلسلے میں منعقدہ اسلامی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے۔ اُن کے ہمراہ ڈائریکٹر عرب کلچرل سنٹر، لاہور ڈاکٹر فیصل ایچ فوزی، طفیل ہوشیار پوری اور عبدالبصیر پال بھی تھے۔ روانگی کے وقت انھوں نے خرابیٔ صحت کی شکایت بھی کی تھی۔

دورانِ سفر اُن پر فالج کا حملہ ہوا۔ اُنھیں ساہیوال پہنچایا گیا تاکہ خیبر میل کے ذریعے لاہور روانہ کیا جا سکے مگر کار کا ٹائر پھٹ گیا اور انھیں مجبوراً ساہیوال ہسپتال داخل کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اُن کی جان بچانے کی سَر توڑ کوشش کی لیکن وہ جاں بر نہ ہو سکے اور شام ۷ بج کر ۲۵ منٹ پر

انتقال کر گئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون

اُن کے انتقال کی خبر مقامی اخبارات میں نمایاں طور پر شائع ہوئی اور اخبارات کے اداریوں میں کئی روز تک اُن کی خدمات کو سراہا جاتا رہا۔

ملک بھر کی ادبی انجمنوں نے اُن کی یاد میں تعزیتی ریفرنس منعقد کیے اور اُن کی خدمات کے اعتراف میں قراردادیں منظور کیں۔

انجمن ترقیٔ اُردو کراچی کے اجلاس میں جو قرارداد منظور ہوئی۔اُس کے الفاظ یوں تھے:

> ''انجمنِ ترقیٔ اُردو کے لیے مولانا صلاح الدین احمد کی وفات حسرتِ آیات ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔وہ اُردو زبان اور ادب کے بہت بڑے خدمت گزار، سپاہی، عاشق اور سرپرست تھے۔ان کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پر نہیں ہوسکتا۔تمام اُردو دُنیا اُن کی صلاحیتوں،ان کے کردار اور ان کی ادبی فتوحات کو یاد رکھے گی۔انجمن کے نزدیک بابائے اُردو کی وفات کے بعد مولانا صلاح الدین احمد کی دائمی مفارقت اُردو زبان کے لیے ایک نقصانِ عظیم کا درجہ رکھتی ہے۔''(۱۹)

یہاں رئیس امروہوی کا تخلیق کردہ قطعۂ تاریخِ وفات بھی قابلِ ذِکر ہے، جس کے اشعار میں مولانا صلاح الدین کی خدمات برائے اُردو اور اُن کے اسلوبِ سخن کو خوب صورت شعری پیرائے میں بیان کیا گیا ہے:

نثرِ اُردو کے کارناموں پر	نقش ہے عظمتِ صلاح الدین
اَدب و نقد و حکمت و انشا	جوہر سیرتِ صلاح الدین
آج بزمِ سخن میں ہے ہر سُو	ماتم رُخصتِ صلاح الدین
کون آخر بھلا سکے گا رئیس	جذبۂ خدمتِ صلاح الدین
ایک طرزِ سخن کی رحلت ہے	سربسر رحلتِ صلاح الدین

(۱۳۸۴ھ)(۲۰)

شخصیت

مولانا صلاح الدین احمد کی شخصیت کے سلسلے میں اُن پر لکھے گئے مضامین میں اُن کے سراپے کا بطورِ خاص ذِکر کیا گیا ہے۔ اِس سلسلے میں عثمان حیدر مرزا[۲۱] مسلم سلیم[۲۲] شیخ عبدالشکور[۲۳]، شاہد احمد دہلوی[۲۴] اور غلام رسول ازہر[۲۵] نے اپنے مضامین میں جو اُن کا ناک نقشہ کھینچا ہے، اُس کے مطابق مولانا صلاح الدین احمد کی رنگت گندمی، پیشانی کشادہ، آنکھیں روشن، قامت بلند، آواز رُعب دار، سینہ چوڑا چکلا، ناک بڑی اور مونچھیں ترشی ہوئی تھیں۔

لباس میں زیادہ تر سوٹ مع ٹائی پسند کرتے تھے۔ لیکن اُن کے مزاج میں مغربیت قطعاً نہیں تھی بلکہ خالص مشرقیت تھی۔

یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اُن کے نام کے ساتھ مولانا کا سابقہ کب لگا اور اِس کی وجہ کیا تھی۔ کیونکہ نہ تو اُن کے پاس کوئی دِینی علوم کی سند تھی اور نہ ہی اُن کی تحریروں میں مذہبی نوعیت کے کوئی مضامین یا کتابیں شامل ہیں۔

مولانا مذہبی اعتبار سے اپنے دِل میں جذبۂ دین وملت ضرور رکھتے تھے لیکن وہ مزاجاً وسیع المشرب آدمی تھے۔ عاتکہ صدیقی لکھتی ہیں:

> ''مولانا ہر مذہب کی باتوں کو سراہتے اور اُن پر عمل کرتے تھے۔ کسی مذہب پر تنقید کرنا انھیں پسند نہیں تھا۔ مذہب کو وہ بندے اور خدا کا معاملہ سمجھتے تھے۔ مولانا کی عادت تھی کہ صبح سویرے ایک درخت کے سائے میں کرسی بچھا کر بیٹھ جاتے، آنکھیں بند کر لیتے اور نہایت عجز وانکسار کے ساتھ خدا کی طرف رجوع کرتے۔ یہ کیفیت دس پندرہ منٹ تک طاری رہتی۔ اپنے الفاظ میں وہ اِسے گیان دھیان کہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اِس عمل سے دِل و دماغ میں عجیب کیفیت پیدا ہوتی تھی اور اِس کے بعد مشکل سے مشکل کام اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو جاتا تھا۔''[۲۶]

مولانا کی وسیع المشربی اور مذہب کے وسیع مطالعے کی تصدیق اُن کے فرزند معزالدین احمد کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''مولانا نے سب مذاہب کا نچوڑ یہ بتایا تھا کہ انسان کو ہمیشہ نیکی کرنی چاہیے۔(Always do good) مولانا نے ہندومت، عیسائیت اور بدھ مت کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ بچوں میں بیٹھ کر اکثر اِس خواہش کا اظہار کرتے تھے کہ میرا اِرادہ ہے کہ ''ہمارا آسمانی ادب'' کے نام سے ایک کتاب لکھوں۔''(۲۷)

مذہبی معاملات میں اِس وسیع المسلکی کے باوجود یہ اَمر باعثِ حیرت ہے کہ بعض خارجی حقائق کے پیشِ نظر اُن کے چند واقعات اُن کی خوش عقیدگی کو ایک سوال بنا دیتے ہیں۔ مولانا کا زمانہ وہ ہے جہاں ایک طرف ہندوستان کے تمام باشندے انگریز سامراج کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ وہاں تقسیمِ ہند کی صورت مذہبی مبارزت کو بھی جنم دے دیا تھا۔ قتل و غارت عام تھی اور مختلف مذاہب کے لوگ اپنے مخالفین کے گھر بھی جلا رہے تھے۔ خود مولانا صاحب کا گھر اور کتب خانہ بھی نذرِ آتش ہوا تھا۔

تحریکِ آزادی کے معروف سپاہیوں میں ایک نام بھگت سنگھ بہت روشن ہے، جسے انگریزوں نے کاکوری کیس کی پاداش میں پھانسی دے دی تھی۔ بھگت سنگھ نوعمر تھے مگر انگریز سرکار کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ اُس کی پھانسی نے جذبۂ آزادی کو اور زیادہ فزوں کیا۔ مولانا کے صاحبزادے وجیہہ الدین احمد لکھتے ہیں:

''ایک بار میں ماتمی جلسے میں شریک ہوا۔ ماتم تھا سردار بھگت سنگھ کا جس نے سیاسی قتل کے الزام میں پھانسی پائی اور شہید مشہور ہوا۔ اِس جلسے میں شہادت کی عظمت پر نظمیں پڑھی گئیں اور آخر میں ڈیڑھ ہزار مرد اور عورتیں گا رہے تھے۔

ع   دیکھیے اب زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

لڑکپن کا یہ تاثر میرے دِل میں بھگت سنگھ اور اُس جیسے تمام انقلاب پسند شہیدوں کی عزت بڑھا گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد میں بھگت پر ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ دیکھ کر بولے کہ اگر تمہاری نظر میں بھگت واجب التعظیم شہید تھا تو اُن سب سکھوں کی عزت کیوں نہیں کرتے جو ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کے قتل کی کوشش یا سزا میں قتل ہوئے تھے۔ وہ بھی تو بزعمِ خود اپنی قومی شمع کے پروانے تھے، خالصہ ناموس کے جاں نثار۔"(۲۸)

مولانا نے جس طرح بھگت سنگھ کا تقابل ۴۷ء کے بلوائیوں سے کیا ہے، ظاہر ہے منطقی نہیں ہے۔ بھگت سنگھ کا کردار ایک سپاہی کا ہے، جو انگریز سامراج کی نفرت کی پاداش میں شہید ہوا نہ کہ وہ کسی خالصہ ناموس کے لیے لڑ رہا تھا۔

اُن کی شخصیت کا ایک پہلو جو بہت پرکشش ہے، وہ پرندوں سے محبت ہے۔ وہ پرندوں سے بے پناہ پیار کرتے تھے بلکہ اُنھیں حصولِ رزق کے معاملے میں اپنا رہنما مانتے تھے۔ انھوں نے پرندوں سے متعلق جو اپنا بیان دیا ہے، وہ اُن کے مخصوص مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ مولانا سرکاری ملازمت پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی ضیاء الدین احمد نے پولیس میں افسر لگوا دیا تھا لیکن انھوں نے اِس وردی کو اپنے آزادی پسند مزاج کے شایان نہیں سمجھا۔ اُن کی مختلف کاروباری نوعیت کی مصروفیتیں رہیں لیکن کبھی کوئی ایسا کام نہ کیا، جس میں جبر و اکراہ کا عنصر شامل ہو۔ وہ رزق کی فراوانی کو بھی خدشات کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کے خیال میں بہت زیادہ آسودگی ادیب کو عیش طلب اور اپنے پیغمبری منصب سے بے گانہ کر سکتی ہے۔

محمود احمد اسیر لکھتے ہیں:

"مولانا صلاح الدین احمد اپنی زندگی کو پرندے کے مماثل قرار دیتے جو صبح سویرے رزق کی تلاش میں نکلتا ہے اور صرف ایک دِن کے لیے

دانا دُنکا تلاش کر کے گھونسلے میں واپس آ جاتا ہے، دوسرے دِن کی فکر نہیں
کرتا۔ کہا کرتے تھے کہ ایک صاحبِ قلم کو آسائشوں کی پیچھے نہیں بھاگنا
چاہیے بلکہ بے نیازی سے زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے
کام لینا چاہیے جو قدرت نے اُسے انعام کے طور پر ودیعت کی ہیں۔"(۲۹)

مولانا کے دفتر میں چھت پر چڑیوں نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ مولانا کام کر رہے ہوتے اور چڑیاں چھت پر سے تنکے پھینک رہی ہوتیں۔ مولانا اِس صورتِ حال کو ناگوار خیال نہ کرتے بلکہ اپنے کام میں چڑیوں کو بھی شاملِ حال سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اوقات دفتر میں اِس لیے دیر تک رُکے رہتے کہ پرندوں نے شام کو گھونسلے میں واپس آنا ہوتا تھا اور مولانا اُن کا انتظار کرتے رہتے۔ اتوار کے روز جب دفتر کا چپڑاسی چھٹی کرتا تو مولانا خود علی الصبح پہنچ جاتے تھے تا کہ پرندوں کے دانے دُنکے کا بندوبست ہو سکے۔ وہ پرندوں سے اِس لیے بھی محبت کرتے تھے کہ اُن کے خیال میں مولانا کی تخلیقی کاوشیں دراصل اِن ہی کے زیرِ سایہ جاری رہتی ہیں۔

پرندوں سے محبت کا ایک واقعہ ڈاکٹر وزیر آغا یوں نقل کرتے ہیں:

"مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ محض اِسی لیے اپنے سفر کو قطع کر کے
واپس آ گئے کہ اُن کے دفتر میں ایک چڑیوں کا گھونسلا تھا اور وہ دفتر کی
کھڑکی غلطی سے بند کر آئے تھے۔ ایک دفعہ کہنے لگے، دیکھو یہ پرندے
کس اعتماد سے شام کو اپنے گھونسلوں کی طرف جاتے ہیں اور کس اعتماد
سے اگلی صبح اُٹھ کر روزی کی تلاش میں پرواز کر جاتے ہیں۔ مَیں نے
روزی کمانے کا ڈھنگ پرندوں سے سیکھا ہے اور کبھی خود کو کل کی فکر میں
مبتلا نہیں کیا۔"(۳۰)

مولانا صاحب کا رزق کے بارے میں فلسفہ بلھے شاہ رحمتہ اللہ علیہ کی اِس فکر کی تفسیر ہے کہ:

اسماناں تے اُڈدے پنچھی ویکھ تے سبھی کی کردے نیں
ناں او کردے رزق ذخیرہ ناں او بُھکھے مردے نیں
کدی کسے نے پنکھ پکھیرو بُھکھے مردے ویکھے نیں
بندے ای کردے رزق ذخیرہ بندے ای بُھکھے مردے نیں

پرندوں سے محبت اور رزق کے معاملات میں اِستغنا نے اُن کی زندگی کو ''برتر از اندیشۂ سودوزیاں'' بنادیا تھا۔ وہ ضرورت مندوں کی امداد و معاونت دِل کھول کر کرتے۔ اُردو زبان کی خدمت کے لیے قائم کردہ اداروں کی بہتر ساکھ کے لیے اپنا مال و اسباب لٹا دیتے تھے اور کبھی نقصان کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ''اکادمی پنجاب'' یا ''اُردو فاؤنڈیشن'' اور ادارہ ''ادبی دُنیا'' کو رواں دواں رکھنے کے لیے اپنا سارا اثاثہ وقف کر دیا تھا اور ایسا کرتے ہوئے کسی مالی نقصان کی پروا نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں اگر کوئی شخص زیاں کا احساس دِلاتا تو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا ایک شعر پڑھ کر خاموش کرا دیتے کہ:

زیاں ہے عشق میں ہم خود بھی جانتے ہیں مگر
معاملہ ہی کیا ہو اگر زیاں کے لیے

مزاج کے لحاظ سے اُن کی ذات کے اوصاف متنوع ہیں۔ ہمدردی اور صلہ رحمی اُن کے اندر بدرجہ اُتم تھی۔ بچوں اور ملازموں کے ساتھ اُن کا حُسنِ سلوک مثالی تھا۔ وہ ملازموں سے کام لیتے تو اُن کے آرام کا بھی خیال کرتے، بعض اوقات اُن کے آرام کا وقت ہوتا تو کام خود ہی کر لیا کرتے تھے۔

استغنا اُن کی نمایاں صفت تھی۔ حصولِ رزق کے بارے میں اُن کی فکر آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ ادبی طور پر بھی وہ بعض معاملات میں بہت ہی غنی واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے زندگی بھر قلم کی مزدوری کی۔ ادبی دُنیا کے اداریے لکھے، کتابوں کے دیباچے رقم کیے، مختلف معاملات پر تنقیدی شذرات درج کیے۔ تنقیدی مضامین لکھے، ریڈیو کے لیے تقاریر کیں، مختلف کانفرنسوں میں

شرکت کر کے مقالات پڑھے مگر یہ امرِ حیرت ہے کہ اُن کی زندگی میں اُن کی کوئی تصنیف یا مجموعۂ مضامین و مقالات شائع نہ ہوا۔ نہ ہی وہ اِس کی پروا کرتے تھے۔

اُن کی تصنیف کی عدم اشاعت کی ایک وجہ اُن کی طبیعت کا اضطراب اور مزاج میں بے ترتیبی کو بھی دخل تھا۔ اُن کی زندگی میں کوئی طے شدہ ترتیب نہیں تھی۔ بس ایک موجِ فراواں تھی کہ جو بہ جو، دریا بہ دریا اور یم بہ یم آگے بڑھتی گئی۔

اُن کی طبیعت کا استغنا ہی تھا کہ وہ جرأت و بے باکی کا بھی پیکر تھے۔ اُن کی آواز میں رُعب اور جلال تو فطری ہی تھا لیکن اِس کا استعمال بھی وہ خوب طور پر کرتے تھے۔ زندگی کے عام سماجی معاملات ہوں یا اُردو کے لیے کوئی عملی کاوش وہ ہمیشہ دوٹوک واضح اور بے باک انداز میں بات کرتے تھے۔ اُن کی بے باکی کے سلسلے میں ایک واقعہ ''ہمایوں'' کے مدیر میاں بشیر احمد لکھتے ہیں:

> ''وہ دِن یاد کرتے ہیں جب انھوں نے کھلے لفظوں میں لاطینی حروف اختیار کرنے کے خلاف اپنی آواز بلند کی اور اِس مجاہدانہ انداز میں بلند کی کہ محتاط حضرات گھبرا اُٹھے کہ خدا جانے اب اُن پر کیا آفت آئے گی۔۔۔ انجمن حمایتِ اسلام کا وہ سالانہ جلسہ یاد آتا ہے، جب انھوں نے صدرِ قوم کی موجودگی میں واشگاف لفظوں میں کہا کہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کہہ کر نہ پکارنا قوم سے بے وفائی کرنا ہے۔ ۱۴ راگست کا وہ دِن یاد آتا ہے، جب انھوں نے لاہور میں صدرِ محترم کی پنجابی تقریر پر یہ کہہ کر شدید اعتراض اور تنقید کی کہ جنابِ صدر کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک ایسے موقع پر قومی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں تقریر کریں۔''[۳۱]

اُردو سے اُن کی محبت اُن کی شخصیت، ذات بلکہ رُوح کا حصہ تھی۔ وہ ''فنا فی الاردو'' تھے۔ زندگی بھر اُردو کی خدمت کی اور اُردو کی ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ خدمتِ اُردو کی یہ کوششیں دامے، درمے، سخنے اور قدمے ہر نوع کی تھیں۔

مولانا صلاح الدین احمد سرسیّد، آزاد اور اقبال سے متاثر تھے۔ اُن کی تنقیدی کاوشوں کا ایک بڑا حصہ آزاد اور اقبال کے لیے وقف ہے۔ سرسیّد کے لیے انھوں نے زیادہ تو نہیں لکھا لیکن اُن کا ایک مضمون ''سرسیّد پر ایک نظر'' بہت اہم ہے جو ''حیاتِ جاوید'' کے ایک ایڈیشن میں بطور پیش لفظ شامل ہے۔ یہاں یہ اَمر بھی قابلِ توجہ ہے کہ سرسیّد کو انھوں نے اپنے لیے رول ماڈل بنا لیا تھا اور خدمتِ قوم کے لیے اُن کے دانشورانہ اقدامات کی پیروی کرتے تھے۔ اُن کے فرزند وجیہہ الدین احمد اُن کی پیروئ سرسیّد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تقلید کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے اُردو پروری کے کام کو ریاستی اعانت کے بغیر جاری رکھا، بلکہ مفر سمجھ کر پیش کش سے اِستفادہ نہ کیا۔ سرسیّد کو وہ ایسا سپہ سالار کہتے تھے کہ جس کے ایک ہاتھ میں برہنہ تیغ عمل ہو اور دوسرے میں ایسی دُوربین جو ماضی، حال اور مستقبل کا احاطہ کر سکے۔''(۳۲)

مولانا کے والدِ محترم احمد بخش کالج سے گھر تک فاصلہ گھوڑے پر طے کرتے مگر فرزند کی آہستہ روی نے پیادہ پائی کو زیادہ مناسب خیال کیا۔ وہ تانگے میں صرف اُس وقت بیٹھتے تھے جب انھیں کہیں تقریر کرنے جانا ہوتا تھا۔ یہاں بھی مدعا جلدی پہنچنے کے بجائے تقریر مکمل کرنا ہوتا تھا۔ انھیں تانگے میں بیٹھ کر تقریر کی تکمیل کا موقع مِل جاتا تھا۔

وہ پیدل چلتے ہوئے موسم کی شدت کی پروا بھی نہیں کرتے تھے اور نہ ہی فاصلے کو خاطر میں لاتے تھے۔ وہ گرمیوں میں بھی یوں پیدل چلتے گویا سیرِ گل کو نکلے ہوئے ہیں۔ اُن کی پیادہ خوئی کا ذِکر انتظار حسین نے بڑے دلچسپ اور افسانوی انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اُردو کی تاریخ میں پہلے محمد حسین آزاد پیدل چلتے تھے، پھر حسرت موہانی نے پیادہ پائی کو شعار کیا اور پرانی دِلّی سے لوک سبھا والی نئی دِلّی تک پیدل چلتے رہے۔ مولانا صلاح الدین احمد ہماری تاریخ کے آخری پیدل آدمی

تھے۔ اب مال روڈ پر ادیبوں کی موٹریں تو نظر آئیں گی مگر مولانا حالؔی کی
طرز کی چھڑی لے کر پیدل چلنے والا ادیب اِس سڑک کے فٹ پاتھ پر
دِکھائی نہیں دے گا۔ اُردو ادب کی یہ تہذیب کل تک پرانی تھی، اب مرحوم
ہوگئی ہے۔''(۳۳)

مرزا فرحت اللہ بیگ نے مولوی وحیدالدین سلیم کی وفات پر کہا تھا:

''مولوی صاحب کیا مرے، زبانِ اُردو کا ایک ستون گر گیا، ستون بھی ایسا
کہ اَب اس جگہ کوئی دوسرا استون تو کجا اڑواڑ لگانا بھی مشکل ہے۔''(۳۴)

مولانا صلاح الدین احمد کی اُردو کے لیے بے پایاں خدمات اور اُردو زبان و ادب کی عصری صورتِ حال کے تناظر میں دیکھیں تو اُن کی تعزیت کے لیے بیگ صاحب کے جملے ہی جذبات کی جامع ترجمانی کرتے ہیں۔ تاہم خراجِ تحسین کے لیے فارسی کا یہ شعر زیادہ مناسب ہے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ڈاکٹر محمود احمد اسیر: ''مولانا صلاح الدین احمد ___ احوال وآثار''لاہور مجلسِ ترقیٔ ادب،۲۰۰۹ء،ص۱۴

۲۔ مولانا صلاح الدین احمد کی ادبی خدمات پر کام کرنے والے بیشتر محققین نے آزاد کے اِس خاکے کا حوالہ دیا ہے، جو جان کپلنگ نے بنایا ہے لیکن کسی محقق نے اِس خاکے کا متن نہیں دیا۔ ذیل میں قارئین کی دلچسپی کے لیے اِس خاکے کا متن درج کیا جارہا ہے:

مولوی صاحب کا گھوڑا

''مولوی صاحب گھوڑے پر سوار ہیں۔ مدرسے جاتے ہیں۔ دو تین شاگرد ساتھ ہیں۔ایک ہاتھ میں کتاب ہے ایک نے سامنے سے آ کر کہا ہے۔مولوی صاحب نے گھوڑا روک لیا۔شاید کچھ اس سے باتیں کریں گے۔ یہ لڑکے بڑے شوقین ہیں۔ایک کچھ پوچھ رہا ہے۔ دوسرا برابر لگا ہے کہ یہ کب ہٹے اور میری باری آئے۔مولوی صاحب بھی دِل سے چاہتے ہیں کہ ان کو کچھ آ جائے۔گھر پر بھی پڑھاتے ہیں۔رستے میں بھی بتاتے ہیں۔ مدرسے کا بھی خیال ہے کہ وقت پر پہنچ جائیں۔ وہاں بہت سے شاگرد بیٹھے راہ دیکھ رہے ہوں گے۔مولوی صاحب بڑے لئیق اور محنتی ہیں۔ ہمیشہ ان کی جماعت کے لڑکے امتحان میں پاس ہوتے ہیں۔سنو میاں لڑکو! علم بڑی دولت ہے۔ جہاں تک ہوسکے حاصل کیے جاؤ۔اُٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے، گھر ہو یا مکتب ہو وقت کو ضائع نہ ہونے دو۔ پڑھنے لکھنے کی یہی عمر ہے۔ پھر ایسی بے فکری کہاں؟ بڑے ہوگے تو دُنیا کے دھندوں میں پھنس جاؤ گے۔اس وقت نہ پڑھا تو عمر بھر پچھتاؤ گے۔''

ابتدائی سطور کے حوالے سے ڈاکٹر اسلم فرخی نے حاشیے میں لکھا ہے:

''بعد کے نسخوں میں اِس جملے کے بعد عبارت یوں ہے: ایک برابر آ کر کچھ پوچھ رہا ہے۔مولوی صاحب نے گھوڑا روک لیا ہے۔اسے بتا رہے ہیں دوسرا پیچھے کھڑا ہے۔ سلام کیا ہے۔ یہ لڑکے بڑے شوقین ہیں۔مولوی صاحب کے گھر جا کر بھی پڑھتے ہیں۔راستے میں بھی پوچھتے جاتے ہیں۔مولوی صاحب بھی دِل سے چاہتے ہیں کہ ان کو کچھ آ جائے۔کبھی پڑھانے اور سمجھانے میں دریغ نہیں کرتے۔ گھر ہو یا باہر ہو۔''

(مولانا محمد حسین آزاد: ''اُردو کی پہلی کتاب'' (مرتبہ: ڈاکٹر اسلم فرخی)، کراچی انجمن ترقیٔ اُردو، ۱۹۶۳ء،ص ۴۸۔۴۷)

۳۔ سیّد علی عباس، جلال پوری: ''مولانا صلاح الدین احمد''فنون، اکتوبر نومبر ۱۹۶۴ء، ص ۳۸۴
۴۔ غلام رسول ازہر: ''مولانا صلاح الدین احمد'' ادبی دُنیا (یادگار نمبر) ۱۹۶۵ء، ص ۲۱۷
۵۔ عبدالمجید عقیقی: ''مولانا صلاح الدین احمد''ہفت روزہ شہاب، ۲۸ جون ۱۹۶۴ء، ص ۹
۶۔ محمد باقر: ''محمد حسین آزاد'' نقوش (شخصیات نمبر) جنوری ۱۹۵۶ء، ص ۱۶۲
7- A History of Govt. College (Edited by LHO Garret, Abdul Hameed) Lahore, Ripon.
۸۔ غلام رسول ازہر: ادبی دُنیا (یادگار نمبر)، ص ۲۱۹
۹۔ الطاف حسین قریشی سے مصاحبہ، اُردو ڈائجسٹ، دسمبر ۱۹۶۱ء، ص ۶۵
۱۰۔ پروفیسر حمید احمد خاں، منٹگمری گزٹ ۲۷ جون ۱۹۶۵ء، ص ۵
۱۱۔ انور سدید: ''مولانا صلاح الدین احمد ـــــ ایک مطالعہ'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۱ء ص ۱۱
۱۲۔ عاتکہ صدیقی: ''مولانا صلاح الدین احمد ـــــ شخصیت اور فن'' لاہور کاغذی پیرہن، ۲۰۰۱ء، ص ۶۹
۱۳۔ شیخ عبدالقادر کے اِس بیان کے راوی ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ہیں، ملاحظہ ہو اُن کا مضمون ''ادبی دُنیا کا نامور مدیر'' مشمولہ ''مولانا صلاح الدین احمد ـــــ شخصیت اور فن'' مرتبہ: ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید کراچی، انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۹
۱۴۔ ''مولانا صلاح الدین احمد ـــــ احوال و آثار'' ص ۳۲
۱۵۔ ''مولانا صلاح الدین احمد ـــــ شخصیت اور فن'' ص ۴۵
۱۶۔ ڈاکٹر انور سدید: ''مولانا صلاح الدین احمد (کتابیات)'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء، ص ۸
۱۷۔ غلام رسول ازہر: ادبی دُنیا (یادگار نمبر)، ص ۲۱۹
۱۸۔ ''مولانا صلاح الدین احمد ـــــ شخصیت اور فن'' ص ۶۳
۱۹۔ ''مولانا صلاح الدین احمد ـــــ شخصیت اور فن'' ص ۱۰۷
۲۰۔ رئیس امروہوی: قومی زبان، جون، جولائی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۷
۲۱۔ عثمان حیدر مرزا: ادبی دُنیا (یادگار نمبر) ص ۶۱
۲۲۔ مسلم سلیم: ایضاً، ص ۸۵
۲۳۔ شیخ عبدالشکور: ایضاً، ص ۳۹
۲۴۔ شاہد احمد دہلوی: ایضاً، ص ۵۵
۲۵۔ غلام رسول ازہر: ایضاً، ص ۲۱۷
۲۶۔ ''مولانا صلاح الدین احمد ـــــ شخصیت اور فن'' ص ۱۰۳

۲۷۔ ایضاً،ص۱۰۲
۲۸۔ ''مولانا صلاح الدین احمد___ شخصیت اور فن''ص۳۶
۲۹۔ ''مولانا صلاح الدین احمد___ شخصیت اور فن''ص۵۹
۳۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا: ادبی دُنیا(یادگار نمبر)ص۳۲
۳۱۔ میاں بشیر احمد: ایضاً،ص۸۲
۳۲۔ ''مولانا صلاح الدین احمد___ شخصیت اور فن''ص۳۱
۳۳۔ انتظار حسین: ادبی دُنیا(یادگار نمبر)ص۵۹
۳۴۔ مرزا فرحت اللہ بیگ: ''مضامینِ فرحت''(حصہ دوم)،لکھنؤ،عہدِ نو پبلی کیشنز،ص۱۷۶

☆☆...........☆☆

دوسرا باب

مولانا صلاح الدین احمد کے قلمی آثار

مولانا صلاح الدین احمد کے قلمی آثار کو درج ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

i۔ تنقیدی کتب اور مقالات
ii۔ ترجمہ شدہ کتابیں
iii۔ ''ادبی دُنیا'' کے اداریے، تنقیدی شذرات اور تلخیصات
iv۔ مختلف کتب کے دیباچے

ذیل میں مولانا صلاح الدین کے قلمی آثار کا مفصل جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

i۔تنقیدی کتب اور مقالات

مولانا صلاح الدین احمد نے زندگی بھر مختلف موضوعات پر لکھا۔ اُن کے علمی مقالات اپنی مخصوص تنقیدی نظر کے ساتھ اُن کے اپنے رسالے ''ادبی دُنیا'' کے علاوہ متعدد اُردو جرائد کی زینت بنے لیکن اپنے مزاج کے استغنا اور درویش طبعی کے باعث کبھی انھیں مدوّن کر کے اشاعت آشنا ہونے کے بارے میں مناسب توجہ نہ کی۔ نتیجتاً اُن کی زندگی میں اُن کی کوئی تنقیدی تصنیف شائع نہ ہوسکی۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''۱۹۴۶ء میں مکتبہ اُردو لاہور نے اُن کے مضامین کا مجموعہ ''صریرِ خامہ'' شائع کرنے کا اعلان کیا لیکن مولانا یہ مجموعہ بھی اپنی زندگی میں چھاپنے پر آمادہ نہ ہوئے۔''(۱)

تاہم یہ اَمر باعثِ اطمینان ہے کہ بعد از وفات ''صریرِ خامہ'' کے عنوان سے اُن کے

مقالات تین جلدوں میں شائع ہوئے۔ یہ تقسیم موضوعات کی واضح حد بندی کی بنیاد پر کی گئی۔ ذیل میں اُن کی تصانیف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

صریرِ خامہ (جلد اوّل)[۲]

''تصوراتِ اقبال''

یہ کتاب جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کے اُن تصورات کا احاطہ کرتی ہے، جو اُن کے فکری سفر میں زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے اُن کی افتادِ طبع کے عکاس ہیں۔ یہ مجموعہ مقالات اُن کے فرزند معزالدین احمد نے مرتب کیا ہے۔ عرضِ مرتب کے عنوان سے چند صفحات پر مشتمل اُن کی ایک تحریر بھی شامل ہے۔ جب کہ ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے نہایت پُرمغز مقدمہ رقم کیا ہے۔

''تصوراتِ اقبال'' میں شامل مقالات کی تعداد ۲۳ ہے۔ ذیل میں اُن کے عنوانات ملاحظہ ہوں:

صریرِ خامہ (جلد دوم)[۳]

''اُردو میں افسانوی ادب''

اِس کتاب کے مندرجات کا تعلق اُردو فکشن اور اِس سے متعلق اہلِ قلم کے ذہنی رُجحانات اور ادبی ارتقا سے ہے۔ بعض مضامین میں اُردو کے افسانوی ادب کے بعض تکنیکی اور اسلوبیاتی پہلوؤں کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

اِس کے مرتب معز الدین احمد ہیں جب کہ مقدمہ اُردو فکشن کے نامور نقاد سیّد وقار عظیم نے رقم کیا ہے۔ اِس کا انتساب اُردو کے نام ہے۔

''صریرِ خامہ'' (جلد دوم) میں شامل مقالات کی تعداد ۲۶ ہے، جن کے عنوانات درج ذیل ہیں:

صریرِ خامہ (جلد سوم) (۴)

''محمد حسین آزاد''

یہ کتاب اُردو کے معروف انشاپرداز اور نقاد محمد حسین آزاد سے متعلق مقالات و مضامین پر مشتمل ہے، جس میں اُن کے اسلوب کے مختلف پہلوؤں اور نظم و نثرِ جدید کے ارتقا میں اُن کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا گیا ہے۔

صریرِ خامہ کا تیسرا حصہ بھی معزالدین احمد ہی نے مرتب کیا ہے جب کہ مقدمہ معروف و ممتاز محقق ڈاکٹر وحید قریشی نے رقم کیا ہے۔ اِس کتاب میں ۱۲ مضامین شامل کیے گئے ہیں، جو درج ذیل عنوانات کی تحت ہیں:

''صریرِ خامہ'' میں اُن کے مدوّن مقالات کے علاوہ ایک کثیر تعداد اُن مقالات کی ہے، جو ملک کے معروف وممتاز جرائد میں شائع ہوئے، جن میں اُن کی اپنے جریدے ''ادبی دُنیا'' کے علاوہ ''حمایتِ اسلام''، ''ہمایوں''، ''ادبِ لطیف''، ''قومی زبان''، ''بزمِ اقبال''، ''نقوش''، ''کتابی دُنیا''، ''نقوش'' اور ''امروز'' میں شائع ہوئے۔

اِس سے قبل کہ اُن کے مقالات کی فہرست پیش کی جائے۔ مولانا صاحب کی اُن تحریروں کا ذکر ناگزیر ہے جو اُن کے قلمی سفر میں اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے:

شمعِ زندگی	خیالستان، لاہور	اپریل ۱۹۲۰ء
تہذیب قبل از تاریخ	// //	۱۹۲۰ء
شیکسپیئر	// //	۱۹۲۰ء

ذیل میں اُن کے مقالات کی مفصل فہرست ملاحظہ ہو، جس سے اُن کی وسعتِ نقد کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے:

ہمارا مختصر افسانہ	ادبی دُنیا، لاہور	اکتوبر ۱۹۴۳ء	ص ۳۱
جدید اُردو شاعری کا مفہوم	// //	نومبر ۱۹۴۳ء	ص ۹
چند نئے ادبی تجربے	// //	جنوری ۱۹۴۴ء	ص ۳۰

آل انڈیا ریڈیو، پشاور

ہمارے افسانوں کی تشبیہیں اور تمثیلیں ادبی دُنیا، لاہور جنوری ۱۹۴۴ء ص ۵۷

ہمارے ادب کا نیا انداز // // فروری ۱۹۴۴ء ص ۱۴

ایڈیٹر کی زندگی کا ایک دِن // // اپریل ۱۹۴۴ء ص ۴۱

یوں عمر گزرتی ہے // // ستمبر ۱۹۴۴ء ص ۳۹

اُردو کے چند یادگار مرثیے (۱) // // نومبر ۱۹۴۴ء ص ۱۲

اُردو کے چند یادگار مرثیے (۲) // // جون ۱۹۴۵ء ص ۱۷

اُردو کے چند یادگار مرثیے (۳) // // جولائی ۱۹۴۵ء ص ۷

آج کی اُردو کتاب // // نومبر ۱۹۴۵ء ص ۵۱

اُردو ناول میں طوائف کا کردار (۱) // // مارچ ۱۹۴۶ء ص ۱۷

اُردو ناول میں طوائف کا کردار (۲) ادبی دُنیا، لاہور فروری ۱۹۴۷ء ص ۴۷

ہندوستان ادب کی پرکھ // // نومبر ۱۹۴۶ء ص ۳۱

تقسیم ملک کا اثر اُردو زبان و ادب پر // // دسمبر ۱۹۴۸ء ص ۹

مغربی پاکستان کی قومی اکادمی // // نومبر ۱۹۴۹ء ص ۴۹

قیوم نظر کا ایک ہلکا سا مطالعہ // // نومبر ۱۹۴۹ء ص ۹۸

عبدالقادر ایک صاحبِ طرز انشاپرداز // // فروری ۱۹۴۹ء ص ۱۱

نذیر احمد کے عمرانی نظریات // // مارچ ۱۹۴۹ء ص ۱۷

نذیر احمد کے چند مثالی اور حقیقی کردار // // مئی ۱۹۴۹ء ص ۱۷

اقبال کا پیغام // // مئی ۱۹۴۹ء ص ۱۲۱

ہمارا ادبی اُفق // // مئی ۱۹۴۹ء ص ۱۶۲

امروز، سالگرہ نمبر ۱۹۴۹ء

اُردو کی ترویج و ترقی کے ذرائع ماہنامہ ادبی دُنیا، لاہور جولائی ۱۹۴۹ء ص ۱۲۳

نذیر احمد کی ہیروئن	ماہنامہ ادبی دُنیا، لاہور	جولائی ۱۹۴۹ء	ص ۱۵۹
ہماری قومی زبان کا مستقبل	// //	دسمبر ۱۹۴۹ء	ص ۱۷
محمد علی ردولوی۔ اُردو کا اوّلیں فطرت نگار	// //	فروری ۱۹۵۰ء	ص ۱۷
شمس آغا۔ ایک ٹوٹا ہوا ستارہ	// //	مارچ ۱۹۵۰ء	ص ۹
عبدالقادر اور ان کی ادبی تحریک	// //	مئی ۱۹۵۰ء	ص ۹
خطبہ صدارت حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی	// //	مئی ۱۹۵۰ء	ص ۱۲۱
چند لمحے سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ	// // اشاعتِ خاص	۱۹۵۱ء	ص ۳۶
جدید اُردو نظم کا ارتقا	// //		ص ۵۱
فکرِ اقبال میں وطن اور ملت کی کش مکش	// //		ص ۷۳
غلطیہائے مضامین (سالانہ خطبہ حلقہ اربابِ ذوق۔ ۱۹۵۰ء)	// //	فروری ۱۹۵۱ء	ص ۷
اصطلاحات و اشارے ہمارے ادب میں	ہفت روزہ حمایتِ اسلام، لاہور	دسمبر ۱۹۵۱ء	
راشد الخیری کی ناول نگاری	ہمایوں	نومبر ۱۹۵۱ء	
میر حسن	ادبِ لطیف، لاہور	اکتوبر ۱۹۵۱ء	
فانی کی ذات	ادبِ لطیف، سالنامہ	۱۹۴۷ء	ص ۱۳۷
اُردو ناول کی چند منزلیں	ہمایوں، لاہور	جنوری ۱۹۵۲ء	
''خوابِ ہستی''، ایک رُوحانی تجربہ	ادبی دُنیا، لاہور	جولائی ۱۹۵۰ء	ص ۵
اقبال کا مردِ مومن	حمایتِ اسلام، لاہور	۲۹ اگست، ۵ ستمبر، ۱۲ ستمبر ۱۹۵۲ء	
تعلیماتِ اقبال	// //	اکتوبر ۱۹۵۰ء	ص ۵
آغا حشر کی قومی شاعری	حمایتِ اسلام، لاہور	یکم اگست ۱۹۵۲ء	
	قومی زبان، کراچی	۱۶/اکتوبر ۱۹۵۷ء	ص ۱

اقبال کا تغزل	ادبی دُنیا، لاہور	جولائی ۱۹۵۲ء	ص ۴۵
ایک پیغام۔ ترقی پسندوں کے نام	؍؍ ؍؍	جولائی ۱۹۵۲ء	ص ۱
اقبال کا تصورِ فقر	؍؍ ؍؍	جون ۱۹۵۳ء	ص ۹
اُردو شاعری میں نعت کا مقام	؍؍ ؍؍	نومبر ۱۹۵۲ء	ص ۲۳
بلادِ اسلامیہ اقبال کی نظر میں	؍؍ ؍؍	مئی ۱۹۵۳ء	
حالی کے ساتھ چند لمحے	حمایتِ اسلام، لاہور	۲۳ نومبر ۱۹۵۱ء	
	؍؍ ؍؍	۱۹ ستمبر ۱۹۵۲ء	
ظفر علی خان کی شاعری	ادبی دُنیا، لاہور	اکتوبر ۱۹۵۳ء	ص ۶۳
محسن کاکوروی کی نعت گوئی	حمایتِ اسلام، لاہور	۱۰/اکتوبر ۱۹۵۲ء	
تسلیمِ جاں ہے زندگی (کلامِ اقبال کی روشنی میں)	؍؍ ؍؍	۱۷/اکتوبر ۱۹۵۲ء	
حالی کے ساتھ چند اور لمحے	؍؍ ؍؍	۱۹ ستمبر ۱۹۵۲ء	
ہنگامۂ آزادی (شعر کے آئینے میں)	؍؍ ؍؍	۷ نومبر ۱۹۵۲ء	
نذیر احمد خطوط کے آئینے میں	حمایتِ اسلام، لاہور	۱۴ نومبر ۱۹۵۲ء	
میرا جی کی نثر	ادبی دُنیا، لاہور	جنوری ۱۹۵۴ء	ص ۲۵
اقبال کا تصورِ معاشرت	؍؍ ؍؍	فروری ۱۹۵۴ء	ص ۲۵
اُردو مرثیے کی اخلاقی اقدار (شجاعت)	حمایتِ اسلام، لاہور	۲۸ نومبر ۱۹۵۲ء	
وطن کا جدید تر تصوّر	؍؍ ؍؍	۱۴/اگست ۱۹۵۳ء	
پھر وطنیت کی طرف	؍؍ ؍؍	۲۴ ستمبر ۱۹۵۳ء	
اقبال۔ پیغمبر حرکت وحرارت	ادبی دُنیا، لاہور	جنوری ۱۹۵۵ء	ص ۱۷
سر سیّد کا خواب اور اس کی تعبیر	؍؍ ؍؍	فروری ۱۹۵۵ء	ص ۲۳
آزاد ایک مرقع نگار	؍؍ ؍؍	مارچ ۱۹۵۵ء	ص ۱۷

میراجی کے چند منظوم تراجم	ماہنامہ ادبی دُنیا، لاہور	اپریل ۱۹۵۵ء	ص ۲۳
پاکستانی بچوں کی تعلیم کا مسئلہ	// //	مئی ۱۹۵۵ء	ص ۴۹
اقبال کا نوجوان	// //	جون ۱۹۵۵ء	ص ۳۳
جدید شاعری پر ایک نظر	// //	جولائی ۱۹۵۵ء	ص ۵۱
خواجہ حسن نظامی ایک صاحبِ طرز انشاپرداز	// //	اگست ۱۹۵۵ء	ص ۸
حمایتِ اسلام ایک طائرانہ نظر	حمایتِ اسلام، لاہور	۲۵ دسمبر ۱۹۵۳ء	
الملک للہ	// //	۱۷ اگست ۱۹۵۶ء	
تلامذاتِ آزاد	// //	۱۴ مارچ ۱۹۵۸ء	
عبدالقادر	ہمایوں لاہور، سالنامہ	۱۹۵۸ء	
کہانی میں ہیجان پسندی	// //	اکتوبر ۱۹۴۳ء	
رُوحِ مشرق	ادبی دُنیا، لاہور	مارچ ۱۹۵۶ء	ص ۱
اقبال کا تصورِ مملکت	// //	مارچ ۱۹۵۶ء	ص ۹
ملوکیت سے نجات	// //	اپریل ۱۹۵۶ء	ص ۱
اقبال کے کوہ وصحرا	// //	اپریل ۱۹۵۶ء	ص ۹
آزاد کا ہیرو	ادبی دُنیا، لاہور	مئی ۱۹۵۶ء	ص ۹
حسرت کی ہفت روزہ ظرافت	ماہنامہ دستور، لاہور	جون ۱۹۵۶ء	ص ۱۳۳
اقبال کا انسانِ کامل	حمایتِ اسلام، لاہور	۲۲ فروری ۱۹۵۷ء	
خطبہ صدارت (انجمن آزاد خیال مصنّفین لاہور)			
نگارشاتِ آزاد کے ڈرامائی عناصر	ہفت روزہ حمایتِ اسلام	۱۵ مئی ۱۹۵۶ء	
اقبال کے کلام میں صبح شام	// //	۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء	
پاک پنجابی کانفرنس	قومی زبان کراچی	۱۶ نومبر ۱۹۶۰ء	ص ۱۵

تاملاتِ آزاد	قومی زبان، کراچی ۱۶جون۱۹۵۸ء	ص۱۱
ہماری قومی زبان اور اس کا رسم الخط	ہفت روزہ 'نصرت' لاہور ۱۶/اپریل۱۹۶۱ء	
چودہری محمد علی (ایک مطالعہ)	ادبی دُنیا خاص شمارہ اوّل ۱۹۶۱ء	ص۱۴۳
مختصر افسانے کے پیش رو	// //	
آزاد کا ایک اور ہیرو	// //	ص۱۹۳
نظم و نثرِ آزاد کے عناصر اربعہ	// //شمارہ دوم ۱۹۶۱ء	ص۳۳
اہلِ اُردو کے لیے ایک لمحہ فکریہ	(لیل ونہار، لاہور) شمارہ۳ ۱۹۶۱ء	ص۲۴۱
آسمان کی بادشاہت	// // شمارہ۴ ۱۹۶۲ء	ص۱۱۷
آزاد کا کلچر	// // // // //	ص۱۸۷
ہماری قومی زبان اور اس کا رسم الخط	// // // // //	ص۲۷۷
ہماری تہذیبی قدریں	// // شمارہ۶ // //	ص۲۸۳
مسرت کی تلاش	// // // // //	ص۲۸۵
ادب میں شوق اور پیشہ	// // // // //	ص۲۸۷
وائے نظامی	ادبی دُنیا، لاہور خاص شمارہ ۱۹۶۳ء	ص۲۵۷
آزاد کی چند اقدار	// // // // //	ص۲۳۳
آزاد اور نظمِ جدید	ادبی دُنیا، لاہور خاص شمارہ // //	ص۲۳۸
کچھ اُردو رسائل کے متعلق	// // // // //	ص۲۴۱
ادب اور ادیب	// // شمارہ۵ // //	ص۲۶۹
فرمائشی ادب	// // // // //	ص۲۷۱
اُردو ناول۔ نذیر احمد سے پریم چند تک	نقوش لاہور، شمارہ ۱۷، ۱۸ // //	ص۲۷۰
دگر دانائے راز	// //، شمارہ ۱۱، ۱۲ // //	ص۳۱

اُردو کے چند مسائل — قومی زبان، کراچی — مئی ۱۹۶۴ء — ص ۳

صدرِ مملکت سے چند تقاضے — ادبی دُنیا خاص شمارہ ۸ — ۱۹۶۳ء — ص ۳

اقبال اور رومی کا ایک محبوبِ مشترک (آفتاب) — // // // // // // — ص ۲۲۵

آزاد کی راتیں — یومِ آزاد میں پڑھا گیا — جنوری ۱۹۶۴ء — لاہور

اقبال کا تصورِ حسن — روزنامہ امروز دس سالہ نمبر — ۲۳ مارچ ۱۹۵۸ء — ص ۱۵

اقبال کا تصورِ وطن — منشوراتِ اقبال، — بزمِ اقبال لاہور

پیغامِ اقبال — روزنامہ جنگ، کراچی — ۲۲ اپریل ۱۹۶۳ء

مرزا غالبؔ نقد و نظر کے آئینے میں — تہذیب الاخلاق، لاہور — مئی ۱۹۶۲ء

کتب خانہ ایک بہشت — رسالہ کتابی دُنیا — ۱۹۶۲ء

تعلیمی کمیشن اور اُردو — قومی زبان کراچی — یکم و ۱۶ مارچ ۱۹۶۰ء — ص ۷

آزاد کی ایک ہیروئن — ادبی دُنیا خاص شمارہ ۱۱ — ۱۹۶۳ء — ص ۲۴۹

ایک کانووکیشن ایڈریس — // // // // // — ص ۲۵۵

چند لمحے طالبِ علموں کے ساتھ (میرے اُستاد) — // // ۱۲ — ۱۹۶۴ء — ص ۲۶۱

ناقابلِ فراموش — // // ۱۲ — ۱۹۶۴ء — ص ۲۶۳

پاکستانی بچوں کی اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ — منٹگمری گزٹ، جلد ۳ شمارہ ۳۲

اسلامیانِ ہند کا مسئلہ — ہفت روزہ ''لاہور''، لاہور — ۱۵ جون ۱۹۶۴ء — ص ۱۶

پاک ہند رائٹرز کانفرنس (خطبۂ استقبالیہ) — لاہور — ۱۹۶۰ء

شعر و ادب میں اسلامی اصلاحیں — ماہنامہ ماہِ نو۔ کراچی — ستمبر ۱۹۶۴ء — ص ۲۶

چند لمحے سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ — ماہنامہ اُردو زبان، سرگودھا — جولائی ۱۹۶۷ء — ص ۵۸

نذیر احمد کی ہیروئن — // // // // // — ص ۶۴

جدید شاعری پر ایک نظر — // // // نومبر ۱۹۶۷ء — ص ۱۶

مولانا صلاح الدین احمد کی مذکورہ کتب اور علمی مقالات کے تناظر میں اُن کے تنقیدی میلانات کا جائزہ لیا جائے تو وہ ہمہ جہت ہیں۔ انھوں نے اُردو ادب کی مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ بعض معاصر مسائل اور تہذیبی و ثقافتی موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا اور اہلِ قلم کے ذہنی رُجحانات پر بھی ارتکاز کیا لیکن جیسا کہ صریرِ خامہ کی تین جلدیں مرتب کی گئی ہیں تو اُن کے سامنے زیادہ تر جن موضوعات پر توجہ نظر آتی ہے، وہ اقبال، آزاد اور ادب ہیں۔

بطور اقبال شناس اُن کی توجہ کا مرکزِ اقبال کا فن کے بجائے اُن کی فکر کے مختلف زاویے ہیں۔ اقبال مملکت اور معیشت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ اُن کا تصورِ معاشرت کیا ہے؟ وہ مملکت، معیشت اور معاشرت کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کس نوع کے انسان کا خواب دیکھتے ہیں؟ وہ نوجوانوں کے نام کیا پیغام دیتے ہیں؟ اُن کے اندر وہ کس نوع کی حرکت وحرارت پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ اقبال وطن اور ملت کے مابین کس طرف جھکاؤ رکھتے ہیں؟ نیز ہندوستان کی معاصر صورتِ حال کے پیشِ نظر وہ وطنیت کے مسئلے کا حل کیا نکالتے ہیں؟ ------ یہ وہ سوالات ہیں جو مولانا صلاح الدین احمد کے پیشِ نظر ہیں اور انھیں بصیرتِ فکر کے مطابق اقبال کے زاویۂ نظر کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں۔

علامہ محمد اقبال سے اُن کی عقیدت بہت تھی، اگر چہ وہ جتنے بڑے شاعر ہیں اُن کی فکر کا حلقۂ متاثرین اتنا ہی وسیع ہے لہٰذا یہ اسباب تلاش کرنا کہ فکرِ اقبال سے کوئی کن اسباب پر سے متاثر ہوا ایک عبث استفسار ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ مولانا صلاح الدین احمد بچپن ہی سے اقبال کے معتقدمین میں تھے اور اُن کی قربت بھی انھیں میسر آئی تھی۔ اُن کے بڑے بھائی ضیاء الدین احمد اقبال کے حلقۂ احباب میں تھے اور اقبال اکثر اوقات اُن کے ہاں شب بسری بھی کرتے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے خیالستان جاری کیا تو جنابِ اقبال نے اِس کوشش کو تحسین کی نظر سے دیکھا اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے مالی معاونت بھی کی۔

یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ وہ فکرِ اقبال سے آشنائی کو جوازِ حیات قرار دیتے تھے اور اِس

سے غفلت کو موت کے برابر خیال کرتے تھے۔ اقبال کے اشعار کو زیرِ بحث لاتے ہوئے مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں:

''کلامِ اقبالؔ سے لطف و سرور کا حصول اور علم و حکمت کا اکتساب ایامِ جوانی ہی سے اس فقیر کا وظیفۂ زندگی رہا ہے اور اُمید ہے کہ دمِ آخر تک یوں ہی باقی و برقرار رہے گا۔ کوئی چالیس بیالس برس کی بات ہے۔ میں اور میرے عزیز ترین دوست منصور احمد مرحوم سرِ شام کنارہ راوی تک جاتے اور راستہ بھر کلامِ اقبالؔ ہی موضوعِ سخن رہتا۔ انھی دِنوں سو اِتفاق سے ایک پڑھے لکھے ہندو نوجوان نے خودکشی کر لی۔ اس شام میں نے منصور احمد مرحوم سے کہا کہ کاش پریم پرکاش، اقبال اور گفتہ اقبال سے آشنا ہوتا، پھر وہ خودکشی کبھی نہ کرتا۔ آپ جانتے ہیں، مرحوم نے اس کا کیا جواب دیا؟ کہنے لگے کہ میں اکثر اس بات پر حیران ہوتا ہوں کہ جن لاکھوں لوگوں کی زندگانی میں شعرِ اقبالؔ کو دخل نہیں، وہ زندہ کیوں ہیں، اور خودکشی کیوں نہیں کر لیتے۔''(۵)

اقبال کی فکر پر لکھنے کے لیے محض عقیدت کافی نہیں، نہ ہی محض اُن کی تخلیقات کا مطالعہ بلکہ اس کے لیے وسعتِ نظر بھی چاہیے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کی تہذیبی فکر کو سمجھنے کے لیے وسعتِ نظر کے ساتھ ساتھ وسعتِ مطالعہ کو بھی اہمیت دی اور یوں اپنی تنقید کو تقابل کی جہات عطا کیں۔ اقبال شناسی کے سلسلے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے کہ:

''اقبال کے اِن مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ راز کھلتا ہے کہ صلاح الدین احمد کا مطالعۂ اقبال کتنا وسیع اور غائر تھا۔ وہ کس طرح کلامِ اقبال کی باریکیوں کی معرفت رکھتے تھے اور انھیں اِس اَمر پر پوری قدرت حاصل تھی کہ کسی مسئلۂ خاص پر اقبال کے پورے کلام سے استشہاد کر سکیں۔''(۶)

مولانا صلاح الدین احمد نے اِس کتاب میں فکرِ اقبال اور مسائل پر مدلل بحثیں کی ہیں۔ اقبال کو موضوع بناتے ہوئے ہماری بیشتر تنقیدی روش بھی یہی رہی ہے کہ فکرِ اقبال کو سماجی اور تہذیبی حوالوں سے سمجھا جائے۔ اِس کتاب میں بھی مصنف نے اپنے سامنے بعض فکری سوالات رکھے ہیں اور اقبال کے کلام میں اُن کے جواب تلاش کر کے قاری تک پہنچائے ہیں۔ تلاش ونقد کے اِسی عمل میں اُن کا زاویۂ نظر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اقبال کو محض ایک شاعر نہیں بلکہ ایک ایسا مسیحا خیال کرتے ہیں جو برصغیر کے اسلامیوں کے فکری اِبتلا کا مداوا جانتے بھی ہیں اور کر بھی سکتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر انور سدید کی اِس رائے سے اتفاق ہے کہ :

> ''مولانا صلاح الدین احمد کے اقبالیاتی مطالعے میں سب سے پہلے اِس بات کا ذِکر ضروری ہے کہ انھوں نے اقبال کو صرف شاعر کے طور پر قبول نہیں کیا بلکہ انھوں نے اقبال کو ایک مفکر اور ایک قومی رہنما کی حیثیت دی اور انھیں دانائے راز کے طور پر قبول کیا۔۔۔ ایک دانائے راز کی حیثیت میں مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کی سیاسی ماحول میں پروان چڑھنے والی اقبال مندی کو اہمیت نہیں دی بلکہ اُن کی فکر بلیغ کے معرکہ آرا مروج کا راز اُن کی خلوت نشینی میں تلاش کیا اور انھیں ایک ایسے ناظر کی حیثیت دی جو خود شریکِ دغا نہیں ہوتا بلکہ ایک بلند ٹیلے پر بیٹھا سارے کارزار کا نقشہ دیکھتا رہتا ہے۔''(۷)

مولانا صلاح الدین احمد کی نظر میں اقبال ایک ایسا ناظر ہے، جو اپنی قومی فکرِ عمیق کے ساتھ سوچتے ہوئے اُس کی حل کی طرف جہت نمائی کر رہا ہے، اِس سلسلے میں وہ حال کی صورت کو ماضی کے تہذیبی تناظر میں جانچتے ہوئے مستقبل کے بارے میں ایک ایسی نظریہ سازی کر رہا ہے جو قومی ارتقا اور وقار کے لیے سودمند ہو۔

اقبال کے تصوّراتِ فکر پر غور کرتے ہوئے مولانا صلاح الدین احمد نے ہمہ جہت

انداز میں سوچا اور لکھا ہے۔ اُن کی تنقید کا ایک پہلو بہت دل آویز ہے کہ وہ فکر پر بعض فنی حوالوں سے بھی غور کرتے ہیں۔ مواد کو اسلوب کی پیمانے پر پرکھنے کا انداز اُن کے ہاں شاذ ہے لیکن جہاں بھی انھوں نے اقبال کے علامتی پیرایوں پر لکھا ہے اُس کی تشریح بہت منفرد انداز میں کی ہے۔ اِس سلسلے میں اقبال کے ہاں آفتاب اور صحرا کی استعاراتی حیثیت پر جو انھوں نے مضامین رقم کیے ہیں اقبال شناسی کے سرمائے میں خاصے کی چیز ہیں۔

اقبال کے کوہ وصحرا کے بارے میں اُن کا مضمون بہت دلچسپ ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''عجمی شعرا نے صحرا کو صرف جنون کی پرورش کے لیے اپنے شعر میں استعمال کیا ہے اور یہی روایت فارسی سے اُردو نے ورثے میں پائی لیکن اقبالؔ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اس نے ہمیں صحرا کی صورت میں اپنی آرزوؤں کی تگ وتاز کے لیے ایک وسعت بے نہایت اور اپنی رُوح کی تسکین کے لیے ایک خلوت بے کنار عطا فرمائی۔ کم وبیش کچھ ایسی ہی صورت کوہ وکُہسار کی ہے۔ عجمی شاعری میں پہاڑ کا زیادہ سے زیادہ استعمال فقط اِتنا ہے کہ فرہاد اس سے جوئے شیر لانے کی کوشش میں اپنی زندگی تمام کردے اور پھر اپنا سر پھوڑ کر مر جائے۔ اُردو میں آ کر اس پر محض اِتنا الم آفریں اضافہ ہوا:

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ
درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

لیکن دیکھیے اقبالؔ نے کوہ اور اس کے تصورات سے کیسا عجیب وغریب کام لیا ہے اسے رفعت وسطوت کا پیکر بنا کر اس کی چٹانوں کو قوت وکردار کا مظہر قرار دیا۔ اسے فقر و بے نیازی اور حرکت وحرارت کے ایک مجسمہ

شاہین کی صورت عطا کی جو اسی کی چٹانوں پر بسیرا کرتا اور اپنا رزق آسمان کی فضاؤں میں تلاش کرتا ہے۔ شاہین کے سوا اقبالؔ کے مردِ کوہستان کو دیکھیے کہ غیرت و صلابت کا ایک پیکر ہے اور اپنے کردار کی مضبوطی و سختی اپنے کُہستانی مسکن ہی سے حاصل کرتا ہے۔''(۸)

اقبال شناسی کے سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد نے اقبال کے ذہنی ارتقا پر بھی ارتکاز کیا ہے۔ لیکن اِس کے ساتھ ساتھ اقبال کے اسلوب اور فنی پہلوؤں پر بھی توجہ کی ہے۔

دلچسپ اَمر یہ ہے کہ وہ جب اقبال کے کسی اسلوب وصف پر لکھتے تو خود بھی نثر میں گویا شعر کہنے لگتے تھے۔ مثلاً بالِ جبریل کے بارے میں انھوں نے جو لکھا ہے، وہ وزن میں تو نہیں لیکن اظہار کے شعری پیرائے سے اِنکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بالِ جبریل کے بارے میں اُن کا بیان ملاحظہ ہو:

''بالِ جبریل ایک تختۂ گل ہے، جس میں لالہ کے ساتھ سمن اور نیلوفر کے پھول بھی کھل رہے ہیں اور اگرچہ مغزِ سخن سر بہ سر ایک ہے۔ پیرایۂ سخن بڑے دِل آویز انداز میں بدلتا اور ہر نوع کے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔''(۹)

مولانا صلاح الدین کے فکری ہیرو اگر اقبال ہیں تو اسلوبیاتی ہیرو محمد حسین آزاد، اُن کی سوچ پر ہر دم شاعرِ مشرق کا سایہ تھا تو اندازِ تحریر نے آزاد کی انشا پردازی کی سائبانی میں نشو و نما پائی۔

آزاد سے اُن کے خاندانی تعلقات بھی تھے۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ محمد حسین آزاد سے اُن کی ہمشیرہ نے فارسی پڑھی اور وہ آبِ حیات کی حافظہ تھیں اور بہت سا حصہ خود مولانا صاحب کو بھی یاد تھا۔ گویا اُن کا اسلوبِ تحریر مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی پیکر کا جزوِ روحانی تھا اور یہ جزو ایک کل کی صورت میں اُن کے اندازِ انشا پر غالب تھا۔ محمد حسین آزاد جس طرح لاہور کی سڑکوں پر پیدل گھومتے تھے اور یہی روانی اُن کے اسلوب میں بھی دیکھی جا سکتی ہے تو مولانا صلاح الدین

احمد بھی اُن کی پیادہ پائی کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ایک رواں دواں انداز میں جادہ پیما رہتے اور اِس صفت کو اپنے اندازِ تحریر میں بھی داخل کیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے مولانا صلاح الدین احمد پر آزاد کے اثرات پر لکھتے ہوئے بہت دِلچسپ بات کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''وہ آزاد کے شاگرد بھی نہیں تھے، اور آزاد کو شاید انھوں نے محض لاہور کی لڑکوں پر جنوں کی حالات میں بے مطلب گھومتے ہوئے ہی دیکھا لیکن اکتسابِ نور کسی تلمذ کے تابع نہیں۔ مولانا نے رُوحانی طور پر آزاد ہی سے فیض حاصل کیا اور زبان وادب کے میدان میں بھی انھوں نے آزاد کے مسلک ہی کو آگے بڑھایا۔ تعلیم کے ایام میں آزاد اُن کے ہیرو بن چکے تھے اور آزاد کے لیے اُن کے دِل میں ایک ایسی گہری محبت جنم لے چکی تھی جو عمر کے ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی۔''(۱۰)

آزاد پر لکھے گئے اُن کے بیشتر مضامین مجلس یادگارِ آزاد میں پڑھے گئے۔ اُن کی توجہ کا زیادہ تر مرکز آزاد کا اسلوبِ تحریر ہے لیکن بعض مضامین میں انھوں نے آزاد کی فکر کو بھی موضوعِ سخن بنایا ہے۔ یہ الگ بات کہ فکرِ آزاد کے جن پہلوؤں پر انھوں نے لکھا ہے، وہ اُن کے الفاظ کے ذخیرے پر مشتمل ہیں بلکہ اقداروں، رویوں سے ہے۔

مولانا صلاح الدین کے بعض مضامین تکرار کے زمرے میں بھی آتے ہیں۔ مثلاً ''نظم ونثرِ آزاد کے عناصرِ اربعۃ'' اور ''اُردو کے تخلیقی ادب میں مولانا آزاد کا مقام'' مواد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ دونوں مضامین میں مولانا آزاد کے چار عناصر کو بیان کیا گیا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد کے نزدیک آزاد کے چار بڑے کارنامے ہیں:

i۔ نظمِ جدید کا فروغ اور اِس کے لیے تنقیدی کاوشیں

ii۔ بچوں کے لیے اُردو نصاب کی کتابیں اور قاعدے

iii۔ اُردو شعرا کا دِل آویز تذکرہ اور تنقیدی دستاویز ''آبِ حیات''

iv۔ عظیم مغل بادشاہ کے دور پر لکھی گئی کتاب ''دربارِ اکبری''

مولانا کے خیال میں آزاد نثر نگار نہ تھے بلکہ تصویر کار تھے۔ وہ لفظ نہیں لکھتے تھے بلکہ مصوّری کرتے تھے۔ اُن کی مرقع نگاری انھیں اُردو نظم و نثر کا مانی و بہزاد بنا دیتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ آزاد نے نظم و نثر دونوں میں بے مثال مصوّری کی ہے اور اگر وہ اتفاقِ زمانہ سے شاعر نہ بنتا اور اُسے ذرا مختلف حالات میسر آ جاتے تو اُس کی افتادِ طبع اُسے بے مثال مصوّر بنا دیتی اور کون جانتا ہے کہ وہ مشرق میں مانی و بہزاد کا نام پھر سے روشن کرتا۔ یہاں ہماری زبان ایک بہت بڑے پیکر گر اور ایک عظیم مرقع نگار سے ضرور محروم ہو جاتی۔ مگر ایسا جبھی ہوتا کہ:

ع بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا''(۱۱)

جدید اُردو نظم کے فروغ میں مولانا محمد حسین آزاد کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اِس سلسلے میں انجمن سازی سے لے کر نظم کے مختلف پہلوؤں پر لیکچرز اور پھر تخلیق و ترجمہ تک اُن کی کاوش لائقِ تحسین ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد، آزاد کو اُردو نظم کے رفیع الشان عمارت کی پہلی اینٹ رکھنے والا قرار دیتے ہیں۔ یہاں وہ جدید نظم سے کوئی ہیئت نہیں لیتے بلکہ ایسی نظم مراد لیتے ہیں جو کسی عنوان کے تحت تسلسلِ بیان کے ساتھ رقم کی گئی ہو۔ اِس سلسلے میں آزاد کی طرف صرف عملی یا تنقیدی کاوشوں کو نہیں سراہا گیا بلکہ تخلیقی کاوشیں بھی تحسین کا مرکز قرار پائی ہیں۔

ترجمے کے سلسلے میں وہ آزاد کی اِس صلاحیت سے بہت متاثر نظر آتے ہیں کہ محض کسی نظم کا مفہوم سن کر اُسے اُردو میں نہایت عمدہ انداز میں منتقل کر دیتے تھے۔ اِس سلسلے میں انھوں نے Henry Wadsworth long fellow (1807-1882) کی نظم excelsior کا بطورِ خاص حوالہ دیا ہے۔ ذیل میں یہ ترجمہ ملاحظہ ہو اور پھر دیکھیے کہ مولانا صلاح الدین احمد اِسے

کن الفاظ میں سراہتے ہیں:

"In happy homes he saw the light
of house-hold fives gleam warm and bright
above the spectral graciers shone
and from his lips escaped a groan.
Excelsior"

خوشحال گھر اور اُن میں خوشی بولتی ہوئی — باتیں کہ دِل سے غم کی گرہ کھولتی ہوئی
گھر گھر اُجالے تھے سرِ دیوار سامنے — دروازوں سے چراغ نمودار سامنے
تھے ہر طرف سے جاڑے کے ساماں پکارتے — تارے بھی اِک کنارے سے تھے آنکھ مارتے
آرام کہہ رہا تھا کہ آگے نہ جا نہ جا — اور میں بھی کہہ رہا تھا، کہ سچ سچ بجا بجا
سمجھانے والے سب یونہی سمجھا کے رہ گئے — اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہہ رہے
چپکے سے گر گیا تو کہا، ہاں بڑھے چلو

"Try not the pass the old man said
dark lowers the tempest over head.
The voaring torrent is deep and wide
and loud the clarion call replied.
Excelsior."

پھیرا تھا منہ ابھی نہ شبِ تیرہ فام نے — اِک پیر مرد تجربہ کار آیا سامنے!
بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے — اور وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے
سنسان جنگل اور یہ درختوں کی سائیں سائیں — چاروں طرف پہاڑ میں ہے دوڑتی بلائیں
طوفانِ برف سر پہ کھڑا ہے تلا ہوا! — ہے یہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا
جاتا کہاں ہے موت کا بھی تجھ کو ڈر نہیں — مانا کہ لطفِ عیش و طرب میں نظر نہیں
گویا ستارا ٹوٹ پڑا آسمان سے — یہ سن کے شعلہ نکلا دِل نوجوان سے
اور اس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو

"O stay "The maiden said" and vest
thy weary head, upon this breast"
A tear stood in his bright
blue eye but still he answered with a sight.
Excelsior."

ناگاہ آئی ایک پری زاد سامنے کی رمز گل سے بلبلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لیے آرام کیجیے رات ہے آرام کے لیے
دیکھا پری کو اس نے مگر چشمِ ناز سے اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے
پھر اِتنا مسکرا کے کہا، ''ہاں بڑھے چلو''(۱۱)

مولانا صلاح الدین احمد اِس ترجمے کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مغرب کا بادۂ گلفام مشرق کے ساغرِ بلّور میں آ کر کسی قدر مشک بو اور آئینہ رو ہو گیا ہے اور اگر چہ اِس ساقیٔ دِل نواز کو ہم سے رُخصت ہوئے آج کی شب نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے مگر دیکھیے اس کی شراب کا نشہ آج بھی تیز اور اُس کی خوشبو آج بھی گل ریز و عطر بیز ہے۔''(۱۲)

آزاد شناسی کا سفر مولانا صلاح الدین احمد کے لیے محض اسلوب آفرینی کا باعث نہیں بنا بلکہ اُن سیرت و کردار میں بھی بعض اوصاف کے نکھار کا سبب قرار پایا۔ اُن کی ذات میں وسیع المشربی کا عنصر دراصل آزاد کے کردار سے اکتساب ہے۔ مولانا صلاح الدین، محمد حسین آزاد کی نگارشات پر لکھے ہوئے اقدار کے اعتبار سے جس عنصر سے بہت زیادہ متاثر دِکھائی دیتے ہیں وہ اُن کی مذہبی وسعتِ نظری ہے۔ اُن کے نزدیک آزاد کا ہیرو اکبرِ اعظم ہے جو ہندوستان میں مذہبی آزادی کی علامت تھا۔

آزاد نے اکبر کو اِس لیے اپنا ہیرو بنایا تاریخ میں بادشاہ محض سروں پر حکمرانی کرتے رہے ہیں لیکن اکبر نے دِلوں کو مسخر کیا۔ اُس نے تسخیرِ قلوب کے لیے جس ہتھیار کو استعمال کیا مذہبی آزادی اور عدمِ تعصب کی فضا کا فروغ تھا۔ اُس کے کردار میں یہی وہ عنصر تھا جو اُسے دُنیا بھر کے

حکمرانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ اپنی معاصر سلاطین سے اِس لیے مختلف تھا کہ وہ محض اپنے اہلِ وطن پر دادِفرمان روائی نہیں دے رہا تھا بلکہ اُنھیں فکری آزادی سے نواز کر ایک روشن فکر کو ترویج دے رہا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد اپنے مضمون ''آزاد کا ایک اور ہیرو'' میں اکبر کی سیرت اور تاجوری کی حکمت کا جائزہ یوں لیتے ہیں:

> ''اکبر اور اُس کے عہد کے دوسرے ممتاز سلاطین میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ جاں دوسرے حکمراں اپنے اپنے ملکوں میں اپنی قوم پر دادِفرماں روائی دے رہے تھے۔ وہاں اکبر محض اپنے چند لاکھ ہم قوم افراد کی موجودگی میں غیر مذاہب اور غیر اقوام کے کروڑوں افراد کے دِلوں کو مسخر کر کے تاریخِ عالم میں سب سے پہلی مشترک سلطنت کی بنیاد رکھ رہا تھا۔''(۱۳)

''آزادی کی چند اقدار'' کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں میں بھی مولانا صاحب نے آزاد کی اِس قدر پر مفصل اور بڑی ہمدردی سے لکھا ہے اور صلحِ کل کی اِس صفت کو قدرِ زرّیں قرار دیا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے آزاد کی اِس قدر کا ذِکر کسی ایک مضمون میں نہیں کیا بلکہ کئی ایک تحریروں میں دُہرایا ہے۔ ''آزاد کا کلچر'' میں انھوں نے مولانا محمد حسین آزاد کے تصوّرِ ثقافت پر مفصل لکھا ہے جس میں آزاد کے اپنی بیٹی کے نام ایک منظوم مکتوب کا بھی حوالہ دیتے ہوئے اِن کی روشنی اقدار کو اُجاگر کیا ہے۔

اقبال پر لکھتے ہوئے مولانا صلاح الدین احمد نے کلامِ اقبال میں آفتاب کے استعارے پر لکھا، اِس کے مقابلے میں آزاد پر قلم اُٹھاتے ہوئے اُن کے ہاں رات کی علامت کو اُجاگر کیا۔

میرؔ سے ناصرؔ کاظمی تک رات اُردو غزل میں محبوب و مرغوب علامت رہی ہے اور شعرا نے اِس کی معنوی حیات سے اِستفادہ کرتے ہوئے غزل کے شعروں میں اِس کی متنوع تمثالیں تراشی ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد نے آزاد کے ہاں رات کی معنویت کو دو پہلوؤں سے اُجاگر کیا ہے۔ایک پہلو اُن کی عملی زندگی میں رات کے اشغالِ حسنہ سے تعلق رکھتا ہے جب کہ دوسرا اُن کی نظموں میں رات کی علامت سے متعلق ہے۔ دوسرے پہلو پر لکھتے ہوئے اُن کی منظومات ''برسات کی رات'' اور ''مثنوی زمستاں، سردیوں کی رات'' کی رات پر مولانا صاحب نے بہت عمدہ لکھا ہے اور اپنی گفتگو کو درج ذیل نکتے پر منتج کیا ہے:

> ''ہم نے ایک حد تک یہ راتیں دیکھی ہیں، آج کل کے نوجوان کو نصیب نہیں۔ خدا حضرتِ آزاد کی تربیت کو عنبریں رکھی کہ وہ اُن کے حسن و جمال کو سخن کی لوحِ محفوظ میں زندۂ جاوید کر گئے وہ خود راتوں کے رسیا تھے اور اُن کی شب بیداریوں میں ہمیں وہ ہمیشہ بہارِ ادب دیا جو اَبد تک اُن کے نام کو روشن اور اُن کے اسالیبِ بیان کو زندہ رکھے گا۔ لیکن وہ راتیں اب کہاں ہیں، اب کون چراغِ نیم شب جلاتا اور اُس کی روشنی میں منزلِ سعادت کا سراغ پاتا ہے۔ یہ باتیں اب خواب وخیال ہو گئی ہیں اور کوئی دِن کی بات ہے کہ انھیں یاد کرتے بھی خواب وخیال ہو جائیں گے۔''(۱۴)

مولانا صلاح الدین احمد کے علمی وتنقیدی مقالات کا تیسرا بڑا موضوع اُردو کا افسانوی ادب ہے۔

پہلے دو موضوعات ادب کو شخصیات کے حوالے سے زیرِ بحث لاتے ہیں جب کہ اِس موضوع میں ادب کو اصناف اور اُن کے ارتقا کی حوالے سے معرضِ بحث میں لایا گیا ہے۔ یہ الگ بات کہ مولانا صاحب نے افسانوی ادب میں بھی بعض ادیبوں کو اپنی گفتگو کا وسیلہ بنایا ہے اور بعض اہلِ قلم اُن کا خاص اور پسندیدہ موضوع بھی ہیں۔

اُردو کے افسانوی ادب پر مولانا صلاح الدین احمد کے نقد ونظر کے جائزے سے قبل یہ اَمر قابلِ ذِکر ہے اُردو میں کہانی لکھنے کا فن، شعر تراشی کے ہنر سے بہت کم عمر ہے۔ اُردو شاعری

کا تخلیقی عمل صدیوں پر محیط ہے تو افسانہ طرازی چند دہائیوں پر مشتمل ہے۔ مثنوی اور داستان سے قطع نظر وہ افسانوی اصناف جو مغرب سے متعارف ہوئیں اور ہمارے ہاں انھوں نے رواج پایا ابھی بہت ہی کم عمر ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو کے افسانوی ادب پر جب تنقید لکھی تو اُردو ناول کی ابھی مسیں بھیگنا بھی شروع نہیں ہوئی تھیں تو اُردو افسانے نے تو ابھی پاؤں پاؤں چلنا ہی سیکھا تھا۔ چنانچہ اُن کی تنقید میں ایسی کوئی سخت گیری کا عنصر نہیں کہ اُردو کے افسانہ طرازوں (Fiction Writer) کی لغزشوں کی اس طرح پکڑ کریں کہ اُن کے اندر تخلیق کا مادّہ متاثر ہو یا اُن کی حوصلہ شکنی ہو بلکہ وہ زیادہ تر یہ کوشش کرتے تھے کہ افسانہ نگار اُن کی تنقید پڑھ کر اپنے اندر لکھنے کا ایک ولولہ پیدا کریں اور اگر اُن کے افسانوں میں ایسی کوئی لغزش ہے بھی تو مولانا صاحب کا طرزِ نقد شفقت کے لہجے سے مملو ہوتا تھا۔

اُردو کے افسانوی ادب پر مولانا صاحب کی تنقید پر سیّد وقار عظیم نے قطعی طور پر بجا کہا ہے کہ:

> ''جس زمانے میں یہ مضمون رسالوں میں چھپے اس زمانے کے قاری کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اِن مضامین نے کئی سطحوں پر رہبری و رہنمائی کی خدمت سرانجام دی ہیں اور رہبری و رہنمائی کی اِس خدمتِ عالیہ سے افسانوں اور ناولوں کے قاری بھی مستفید ہوئے اور ان کے خالق بھی۔ قاری کو دوسری جنگِ عظیم کے آغاز سے قیامِ پاکستان تک اور قیامِ پاکستان کے بعد تقریباً بارہ تیرہ سال تک مطالعے کے جن مرحلوں سے گزرنا پڑا، اُن میں مولانا صلاح الدین احمد کی تنقید ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال مسلسل اس کی رفیق اور رہنما رہی اور فن کار (یعنی ناول نگار اور افسانہ نگار) اس دور میں اضطراب، انتشار، تغیر اور انقلاب کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے

جس ہیجان اور کشمکش سے دوچار رہا اس میں اسی تنقید نے اُسے اس کی منزل سے آشنا کیا اور اُسے اس سفر کے نازک مرحلوں اور قسم بہ قسم موڑوں کے خطرات سے آگاہ کر کے اس پر سفر کی راہیں آسان کیں۔"(۱۵)

مولانا صلاح الدین احمد کسی معروف معنوں میں سماجی نقاد نہ تھے لیکن اُردو کے افسانوی ادب پر اُن کی تنقید میں سماجیات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سماج کی یہ بحثیں ایک اعتبار سے فطری بھی ہیں کہ ہماری جدید افسانوی اصناف ایک ایسے دور میں پروان چڑھ رہی تھیں جو مشرق میں ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلی کا دور ہے اور ہمارے ادیب موضوع اور اسلوب ہر دو سطح پر تبدیلی کے اِس عمل سے متاثر ہو رہے تھے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے نذیر احمد اور سرشار پر اپنی تنقید میں اِن تبدیلیوں کو خاص اہمیت دی ہے۔ وہ نذیر احمد کے عمرانی نظریات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ہر وہ ادیب جو اپنا تخلیقی مواد ماحول سے حاصل کرتا ہے، اپنے زمانے کے مخصوص عمرانی رجحانات سے متاثر ہوتا ہے اور کبھی کبھی وہ ان پر غور و فکر اور تنقید بھی کرتا ہے لیکن بعض ادیبوں پر سماجی تقاضوں کا اثر غیر شعوری انداز میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کی اکمل سماجی اقدار کو اپنی ذات میں پوری طرح جذب کر لیتے ہیں تا آنکہ یہ اقدار یا مقاصد ان کی جذباتی زندگی کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ہر تخلیقی عمل جمالیاتی اور فنی مقاصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے معاشرتی مقاصد کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔ وہ اس شدت سے اپنے آپ کو سماجی مقاصد سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں کہ تخلیقی منصب اور سماجی منصب کا تضادِ باہم ماند پڑ جاتا ہے۔۔۔ اس نوع کے ادیب کبھی شعوری طور پر سماجی مسائل کو سلجھانے اور ان کے عقلی حل تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ ایک خاص

ڈھب کی زندگی بسر کرنے اور چند مخصوص تجربات سے دوچار ہونے کی بنا
پر ہی اپنی سماجی اقدار مرتب کر لیتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں نہ کہیں
پندووعظ کا شائبہ گزرتا ہے اور نہ نظریہ پردازی کا سراغ ملتا ہے۔ بلکہ ناظر
غیر محسوس طور پر ان کے نتائج فکر سے متاثر ہوتا چلا جاتا ہے۔"(۱۶)

اِسی طرح شرر کے ناولوں کے تناظر میں انھوں نے ہندوستان میں مسلم تہذیب کے زوال پر عمدہ بحث کی ہے۔ اگر چہ یہ بحث ناول نگار کی معاشی مقتضیات کے حوالے سے ہے لیکن ایک چھوٹے سے نکتے پر بات کرتے ہوئے انھوں نے اپنی بحث کو ایک تہذیب کے عروج و زوال کی طرف موڑ دیا ہے۔ اُردو ناول کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے وہ شرر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شرر نے اپنے موضوع کے انتخاب میں بڑی زمانہ شناسی اور دُور بینی
سے کام لیا تھا، اس نے مسلمانوں کے زوالِ سیاست کے ذہنی ردِّعمل سے
پورا فائدہ اُٹھایا اور ایک قوم کی قوم کو ان رومانی بھول بھلیاں میں لے جا
کر گم کر دیا جو اس کی فنکاری نے اسلامی تاریخ کے پس منظر پر افسانہ و
حقیقت کی آمیزش سے تیار کی تھیں۔ ستاون کے ناکام ہنگامۂ آزادی کے
بعد ہندوستان کے مسلمان اس ملک میں کسی کے سیاسی تفوق کے تخیل سے
بھی محروم ہو چکے تھے، ان کا حال و مستقبل دونوں غیر یقینی اور مایوس کن
تھے۔ اس لیے فطری طور پر ان کی رومانی نظریں بار بار اپنے شاندار ماضی
کی طرف اُٹھتی ہیں، شرر کی دانش وری نے یہ نکتہ پالیا تھا اور اسے پاتے
ہی انھوں نے اسے اپنے فنی اور معاشی محور کا مرکز کر دیا۔ وہ ایک پیشہ ور
مصنف تھے اور اپنی ادبی و فنی کاوشوں میں انھیں اپنی معاشی مقتضیات کا
بھی خاصہ لحاظ رکھنا پڑتا تھا۔۔۔"(۱۸)

رتن ناتھ سرشار کے ناول "فسانۂ آزاد" پر بھی گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے اِس پہلو

پر بطورِ خاص لکھا ہے۔ اِس کا مصنف اگر چہ ہندو ہے لیکن اُس نے اِس ناول کی بنیاد پر اسلامی معاشرت اور اُس کے زوال پر رکھی۔

مذکورہ ناول نگار چونکہ اُردو میں ناول نگاری کے اِبتدائی نام ہیں اور اِس زمانے کے ناولوں میں فکشن کا وہ عروج نہیں ہے جو ہمیں فی زمانہ اُردو کے ناولوں میں ملتا ہے یا اُس وقت کے مغربی ادب میں دیکھا جا سکتا تھا بلکہ یہ ناول نگار کہانی لکھنے کے ساتھ ساتھ ناول کی ہیئتی خدوخال متعین کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور خود اِس سلسلے میں کما حقہ، واضح نہیں تھے۔ چنانچہ اِن کے ہاں فنی طور پر بعض ایسے مسائل ہیں جن پر مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا اور اُن خدوخال پر بحث کر کے ناول کی ہیئتی تشکیل کی کوشش کی۔ اِس سلسلے میں انھوں نے ناول کے عناصرِ ترکیبی پر جہاں مناسب سمجھا مدلل اور مفصل لکھا۔

اس کے علاوہ ایک اور مسئلہ جسے مولانا صلاح الدین احمد نے اہمیت دی، وہ ناول نگاری میں مقصدیت کا عنصر ہے۔ اپنی مجموعی تنقید میں بھی وہ ادب برائے افادہ یا فن برائے مقصدیت کے قائل نہیں ہیں اور یہی عقیدہ اُن کا ناول کی تنقید میں بھی واضح ہے۔ اِس سلسلے میں وہ نذیر احمد کے مدّاح ہونے کے باوجود اُن کے کڑے ناقد کے طور پر بھی سامنے آتے ہیں۔ وہ انھیں طبعاً قصہ گو سمجھتے ہیں اور اِس بات کے بھی معترف ہیں کہ وہ کہانی کے فن اور اُس کی باریکیوں کا اِدراک رکھتے تھے لیکن اِس کے باوجود مقصد کو اہمیت دینے کی وجہ سے وہ داستان طراز سے زیادہ مصلح کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ ایک جگہ مولانا صاحب نے نذیر احمد کے ناولوں کو ''قصے کے پیرائے میں عمرانی مقالے''(۱۸) بھی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ انھوں نے اپنے خیالات کو محض زود ہضم بنانے کے لیے ناول کا انداز بخشا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ نذیر احمد کے خیالات کہانی کے رُوپ میں بھی زود ہضمی کے بارے میں اپنے قارئین کے لیے ایک سوال ہیں۔ نذیر احمد کے بارے میں مولانا صاحب کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''نذیر احمد طبعاً قصہ گو تھے اور قصہ گوئی کے فن کی بہت سی باریکیاں اور

خوبیاں انھیں فطری طور پر ارزانی ہوئی تھیں۔۔۔نذیر احمد تک پہنچتے پہنچتے ہمارے ناول نے طرزِ جدید کا وہ لباس پہن لیا تھا جو آج بھی اِس کے قدِ موزوں پر بدزیب نہیں لگتا۔ نذیر احمد صحیح معنوں میں اُردو کے پہلے ناول نگار تھے۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کے اظہار سے بھی گریز نہیں کرتے کہ: ایک شدید قسم کی مقصدیت کے باوجود وہ بار بار اپنے راستے سے بھٹک کر فنی افسانویت کی شاداب وادیوں میں گم ہو جاتے ہیں اور ان کا ناظر چند سنہری لمحوں کے لیے مصلح نذیر احمد سے مخلصی پا کر فن کار نذیر احمد سے آشنا ہو جاتا ہے۔ نذیر احمد اگر سرسیّد کی اسلامی تحریک کے نسوانی حصے کے مدارالمہام نہ ہوتے تو اُردو افسانہ نگاری کو ایک بہت بڑا فنکار ہاتھ آ جاتا۔۔۔لیکن اپنی مخصوص تربیت اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے دباؤ سے وہ داستان نگار بنتے بنتے مصلح بن کر رہ گئے۔''(۱۹)

ناول نگاری کے فنی مباحث کے سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد نے اِس کے عناصرِ ترکیبی میں پلاٹ پر کئی حوالوں سے بحث کی ہے۔ اِس سلسلے میں جہاں انھوں نے نذیر احمد کی مقصدیت سے قصے کی ساخت کو پہنچنے والے نقصان پر بات کی ہے، وہاں سرشار کے ناول ''فسانۂ آزاد'' میں قصے کی بے جا طوالت سے پلاٹ کے متاثر ہونے کی نشان دہی کی ہے بلکہ اُن کے نزدیک سرشار ناول نگار نہیں بلکہ، افسانہ نگار تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''فسانۂ آزاد ضابطے کی رو سے ناول نہیں ہے۔ وہ ہماری زبان میں بس طویل افسانہ نگاری کا ایک تجربہ تھا۔''(۲۰)

کردار نگاری پر بحث کرتے ہوئے مولانا صلاح الدین احمد نے زیادہ تر توجہ نسوانی کرداروں پر کی ہے۔ اِس کی وجہ اُن کا زاویۂ نظر نہیں بلکہ اُس کے ناول نگاروں کا رجحان ہے۔ ایک طرف کہانیوں کے ذریعے گھریلو نوعیت کے کرداروں پر توجہ تھی تو دوسری طرف سماجی سطح پر

طوائف کے یکردار کو اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ نذیر احمد کے اکبری اور اصغری راشد الخیری کی نسیمہ، سرشار کی بی اللہ رکھی اور مرزا رُسوا کی امراؤ جان ادا پر مولانا صلاح الدین احمد نے جاندار تنقیدی نکات اُٹھائے ہیں۔ اُن کے نزدیک نذیر احمد کے نسوانی کردار ''اپنی حرکت اور عمل میں اپنی فضا کی معاشرتی پابندیوں میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔''(۲۱) اُن کی نوعیت جامد یا type کرداروں کی ہے۔ البتہ ''محصنات'' میں اُن کی نسائی کردار نگاری میں مہارت اور چابک دستی نمایاں ہے۔ راشد الخیری نے نسیمہ کے کردار میں عورت کے دُکھوں کو اُجاگر کیا ہے۔ سرشار کا کردار ثریا بیگم نہایت جاندار ہے۔ نسوانی کرداروں کی سلسلے میں مرزا محمد سعید نے بعض سماجی مسائل کو بہت عمدگی سے اُجاگر کیا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو ناول کے نسوانی کرداروں پر اپنے تنقیدی خیالات کے سلسلے میں رُسوا کی امراؤ جان ادا پر اپنی نوعیت کی منفرد تنقید کی ہے۔ اُن کے نزدیک یہ کردار اُردو ادب میں دیوانِ غالب کی طرح محبوب ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''رُسوا نے اجتہاد سے کام لے کر اپنے ناول کی جان اُس عورت کو بنایا جو اپنے وقت کی سوسائٹی میں موجود تھی بلکہ اُس کی رُوحِ رواں تھی، اِس غیر معمولی اقدام نے نہ صرف اُس کی نگارش میں ایک فطری اور دِل افروز کیفیت پیدا کر دی۔ اِسے دوام اور استقلال کی خصوصیات سے بھی ممتاز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ غالب کی طرح امراؤ جان ادا آج اپنی نمود اوّلین کے زمانے کی بہ نسبت بہت زیادہ مقبول و محبوب ہے۔''(۲۲)

اُردو ناول پر مولانا صلاح الدین احمد کے مذکورہ تنقیدی خیالات کے تناظر میں یہ کہنا بجا ہوگا کہ اُن کی تنقید رہنما اصول متعین کرتے ہوئے بڑی واضح اور دوٹوک ہے۔ شان الحق حقی کا یہ کہنا بجا ہے کہ:

> ''انھوں نے اُردو ناول کے آغاز اور اُٹھان، ناول نگاروں کے فن، ناول

کی دُنیا کے کرداروں، کہانیوں اور سماجی و معاشی پس منظر کی بابت بے جا
طول کلام کے بغیر واضح اور دوٹوک انداز میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو
کہنے کے قابل ہے۔''(۲۳)

اُردو کے افسانوی ادب پر گفتگو کے سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد نے جس قدر مضامین ناول پر لکھے، افسانے پر بھی اُن کی توجہ اُسی قدر رہے۔

اُردو افسانے کی اِبتدا کے کچھ ہی عرصہ بعد اُردو افسانہ ترقی پسند خیالات اور نظریات کا حامل ہو کر ادب برائے افادہ کی طرف مائل ہو گیا۔ چنانچہ مولانا صلاح الدین احمد کی افسانے پر تنقید کے سلسلے میں یہ عنصر بہت نمایاں ہے کہ وہ ترقی پسندوں پر جگہ جگہ طنز کے نشتر چلاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اُردو افسانہ کا یک ایسی آزاد فضا میں سانس لے، جسے وہ اپنے تنقیدی ماحول میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُردو ناول پر بھی تنقید کے سلسلے میں وہ کہانی کے افادیت کے پہلو پر معترض ہیں اور یہی روش اُن کی افسانے پر گفتگو کے سلسلے میں بھی واضح ہے۔ وہ ادب کو مزدور کے بجائے زندگی کا عکاس بنانا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات مزدور حقیقی معنوں میں خود زندگی کا مظہر ہوتا ہے کہ وہ حرکت، تعمیر اور رزقِ حلال کی علامت ہوتا ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں:

''میں کہتا ہوں ترقی پسند اَدب وہی ہے جس کا محور مزدور نہیں بلکہ زندگی
ہے اور ظاہر ہے زندگی مزدور سے بہت بڑی چیز ہے۔ ہر وہ اَدب جو
زندگی کی ہزارہا کیفیتوں میں سے کسی ایک کیفیت کی مخلصانہ ترجمانی
کرے، ترقی پسند کہلانی کا پورا حق دار ہے۔ زندگی خود اَدب پیدا کرتی
ہے۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں اور جس طرح پانی اپنی سطح خود
تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح آرٹ بھی خود بہ خود اپنے آپ کو زندگی کے
مطابق ڈھالتا چلا جاتا ہے۔''(۲۴)

مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو افسانے پر مجموعی حوالے سے بھی لکھا اور اُردو

افسانے کے موضوعات، اسالیب اور دیگر رجحانات پر اپنی آرا کا اظہار کیا۔ اسی سلسلے میں وہ ترقی پسندوں کے اِس رویے سے نالاں دِکھائی دیتے ہیں کہ وہ اُردو افسانے میں ایسی معاشرتی عکاسی پر ارتکاز کرتے ہیں جو سماج میں ہیجان پسندی کا باعث ہے۔

اُردو کے افسانوی ادب میں انھوں نے پریم چند، یلدرم، کرشن چندر، عصمت چغتائی، محمد علی ردولوی اور شمس آغا پر بہت عمدہ مضامین لکھ کر مذکورہ افسانہ نگاروں کا انفرادی مطالعہ کیا ہے۔ اِس انفرادی مطالعے میں بعض افسانہ نگاروں پر انھوں نے کچھ زیادہ ہی توجہ مرکوز کی ہے بلکہ بقول عاتکہ صدیقی:

> ''یوں تو مولانا نے سبھی افسانہ نگاروں کے فن کو سراہا ہے، اُن کے فن کے بارے میں تحسینی جملے لکھے ہیں اور اُن کی حوصلہ افزائی کی ہے لیکن تین افسانہ نگار ایسے ہیں جن کے فن پر انھوں نے دِل کھول کر داد دی ہے: شمس آغا، کرشن چندر اور عصمت چغتائی۔''(۲۵)

شمس آغا کو داد دینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اُن کی اپنی دریافت تھے اور اُن کے تمام افسانے مولانا صاحب کے رسالے ''ادبی دُنیا'' میں شائع ہوئے وہ انھیں اُردو افسانے کا سب سے کم عمر جینئس (Genius) قرار دیتے تھے۔

عصمت چغتائی کی پسندیدگی کی وجہ اُن کے ایسے کردار ہیں جو حقیقی معنوں میں زندگی کی نفسیاتی عکاسی کرتے ہیں وہ اپنے عہد کی روشن خیال اور ترقی یافتہ ذہنیت کی علمبردار ہیں۔ وہ معاشرے کے کسی ایک طبقے کی نمائندہ نہیں بلکہ ہر طبقے کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ اِس کے علاوہ عصمت کے اسلوب میں ایمائیت نمایاں ہے۔ وہ ہندوستانی عورت کی ذہنی نشو و نما پر مختلف زاویوں سے لکھتی ہیں اور خود کو ایک نبض شناس کے طور پر پیش کرتے ہوئے سچی ادیب ہونے کا ثبوت دیتی ہیں۔

مولانا صلاح الدین احمد کے نزدیک کرشن چندر زندگی اور آرٹ کا امتزاج ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں جنسی موضوعات کو سنجیدگی اور فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ نبھاتے ہیں۔ کرشن

چندر کا اسلوب اُن کے فن افسانے کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ کرشن چندر کے بارے میں مولانا کے خیالات میں توازن اور تنوّع دونوں صفات ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''کرشن چندر میری ناقص رائے میں ایک مجموعی اضداد ہے۔ وہ اَدب میں رومانیت اور حقیقت پرستی، فرار اور پے کار، شادابی اور ویرانی، کامرانی اور شکست، جنت اور جہنم کا ایک دِل کش امتزاج پیدا کرتا ہے لیکن ایک بات میں وہ ہمیشہ یکساں رہتا ہے۔ سوسائٹی سے بغاوت میں، سماج سے سرکشی میں، ضوابط سے انحراف میں۔ وہ ہماری مہذب بربریت اور متمدن وحشت کے خلاف سراسر احتجاج ہے۔ ایک سنگین مگر مرمریں احتجاج۔ وہ ہماری معاشرت کے فریب ورسوم پر ایک زندہ تبسم ہے۔ ایک تلخ دِل نواز تبسم۔ جب وہ زندگی کی لطیف ناکامیوں پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتا ہے تو وہ اس کی پرتو سے چمک اُٹھتی ہیں وہ انھیں دیکھتا ہے۔ وہ ہمیں دِکھاتا ہے اور خاموشی سے گزر جاتا ہے۔''(۲۶)

مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو کے افسانوی ادب پر اسلوبیاتی حوالہ سے بھی بعض عناصر پر عمدہ انداز میں تنقید کی ہے۔ اُن کا مضمون ''ہمارے افسانوں کی تشبیہیں اور اِستعارے'' منفرد ہے، جس میں انھوں نے افسانوی ادب میں شعری عناصر تلاش کرنی کی سعی منفرد کی ہے۔ اِسی طرح اُن کا مضمون ''اُردو ناول کی چند غزلیں'' ناول نگاروں کے ذوقِ شعری پر ارتکاز کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد کی تنقید کی غالب تین جہات اقبال، آزاد اور افسانوی ادب کو مجموعی طور پر دیکھیں تو اوّل االذکر دو موضوعات میں اُن کا تنقیدی وژن وسعت اور موضوع کے ساتھ عقیدت کا حامل ہے۔ وہ اقبال کو اپنا فکری مرشد اور آزاد کو اپنا اسلوبیاتی ہادی تسلیم کرتے ہیں۔ اقبالیات کے سلسلے میں اُن کے ہاں توضیح اور تشریح کے ساتھ ساتھ علمی وسعت اور دلیل کے

عناصر واضح ہیں۔ جب کہ آزاد کی مداحی اور اُن کے اسلوب اور بعض اقدار کے باعث ہے۔ وہ آزاد کو محض ایک مرقع نگار ہی نہیں بلکہ ایسے صاحبِ اقدار آدمی کے طور پر دیکھتے ہیں جو معاشرے میں وسیع القلبی اور وسیع المشربی کو فروغ دینا چاہتا ہے۔

افسانوی ادب پر اُن کی تنقید میں رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا عنصر غالب ہے۔ وہ اپنی رائے دوٹوک دیتے ہیں لیکن لہجے میں ترشی کا عنصر نہیں آنے دیتے بلکہ ایک متوازن اور معتدل نقاد کا فریضہ انجام دیتے ہوئے ناول اور افسانے کے فروغ میں ایک دانشور نقاد کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ''اُردو میں افسانوی ادب'' کے مندرجات اپنے عہد کے تناظر میں بہت اہم اور تاریخ ساز ہیں۔ اُردو کے افسانوی ادب کو اپنے اِبتدائی دور میں اگر صلاح الدین احمد میسر نہ آتے تو بعض کہانی کاروں کے ہاں ایک خلا نے جنم لینا تھا اور اُن کے مستقبل کا نقشہ قدرے مختلف ہوتا۔

''صریرِ خامہ'' کے علاوہ دیگر علمی مقالات کے تناظر میں مولانا صلاح الدین احمد کی نثر کا جائزہ لیا جائے تو ایک بڑا موضوع شاعری اور شعرا پر اُن کی تنقید سامنے آتا ہے۔

شاعری پر تنقید کے سلسلے میں وہ شعر کی ماہیت، تاثیرِ سخن، شاعری کی اصناف اور اُن کے امتیازی خدوخال، کلاسیکی شعرا اور نظم جدید کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا ہے۔

شاعری پر مولانا صلاح الدین احمد کی تنقید میں ایک خاص عنصر قومی فکر کا ہے اور بعض شعرا کو اِسی زاویے سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جدید شعرا کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت اقبال کو دیتے ہیں بلکہ شعر کی تاثیر کے سلسلے میں وہ عموماً اقبال کے اِس شعر ہی کا حوالہ دیتے ہیں:

سخن میں سوزِ الٰہی! کہاں سے آتا ہے؟
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

شعر اُن کے نزدیک پیغمبری کا جزو ہے اور شاعر حقیقی معنوں میں تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''پیغمبرانہ الہام، حکیمانہ الہام اور فنکارانہ الہام میں فرق صرف درجے کا

ہے، ورنہ الہام کی اساسی خصوصیات ایک سی ہیں۔''(۲۷)

اصنافِ سخن کے سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد کا وژن جدت کی بجائے روایت کی پاسداری کا قائل ہے۔ اگرچہ اُن کی تنقید ایک ایسے دور سے تعلق رکھتی ہے، جب بہت سی مغربی اصناف کو یہاں پذیرائی حاصل ہو چکی تھی اور ہمارے جدید شعرا انھی اصناف کو اپنا وسیلۂ اظہار بنا رہے تھے، خود مولانا صلاح الدین احمد میرا جی ایسے جدید شاعر کے مداح اور اُن کے ناشر بھی ہیں لیکن آزاد نظم کی بحث کے سلسلے میں وہ اِسے قبول کرنے سے گریزاں ہیں۔ وہ جدید شاعری محض انقلابِ ہیئت کو قرار نہیں دیتے بلکہ شاعر کے اندازِ نظر کو جدت کا منبع سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہماری قدیم اصناف مثنوی، مسدس اور مخمس بھی جدید ہو سکتے ہیں۔ اُن کی ہیئت ظاہری تو قدیم ہوگی مگر اُن کا داخل جدید اوصاف سے مملو ہوگا۔

مولانا صلاح الدین احمد کے نزدیک مسلمہ اسالیبِ سخن اور مروجہ استعارات و تشبیہات سے گریز دراصل جدت ہے اور احساسات کی تازگی دراصل نئی شاعری کہلانے کی حق دار ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا آزاد نظم کے اِس لیے بھی مخالف ہیں کہ ترقی پسند شعرا کا یہ وسیلۂ اظہار ہے اور شہرِ سخن میں نظم کے بجائے انتشار کی علامت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''آخر ایک چھوٹی سی طرزِ اظہار، جو مغرب سے اتصال کے باعث ایک تجربے کے طور پر ہماری نظم میں داخل ہوئی تھی اور قطعاً ہمارے مزاجِ ادب کے موافق نہیں ہے، اس بات کا کیا حق رکھتی ہے کہ وہ نظم میں ایک مستقل صنف کی حیثیت اختیار کرے اور ترقی پسندی کا جامہ پہن کر اُن تمام حدود کو توڑ ڈالے جو صدیوں کی جانکاہی، دیدہ ریزی اور دماغ سوزی کے بعد ترتیب دی گئی تھیں۔ جو ایک بڑی حد تک حریمِ شاعری میں ہنگامہ اور انتشار اور بدنظمی و اَبتری کا راستہ لے کر کھڑی تھیں۔''(۲۸)

انفرادی طور پر انھوں نے جن شعرا کا مطالعہ کیا، اُن میں کلاسیکی شعرا میں میر حسن اور

مرزا غالب کے نام قابلِ ذِکر ہیں۔ اُن کی توجہ کا زیادہ تر مرکز جدید شعرا ہیں، جن میں حاؔلی، اقبالؔ، ظفر علی خاں، محسن کاکوروی، حسرت موہانی، میرا جی اور قیوم نظر ہیں۔

اِس کے علاوہ اُن کے بعض مقالات نظری مباحث پر بھی مستقل ہیں۔ اِس کے سلسلے میں انھوں نے جہاں اُردو شاعری میں نعت کا مقام متعین کیا ہے وہاں آزادی کے وقت کی عصری صورتِ حال کو شعر کے آئینے میں بھی دیکھا ہے۔ جدید شاعری پر ایک نظر ڈالی ہے تو ادب میں شوق اور پیشہ نیز مسرت کی تلاش پر بھی عمدہ گفتگو کی ہے۔

مرزا غالب کو انھوں نے اُن کی تخلیقی دُنیا میں دیکھنے کے بجائے اُن پر کی گئی تنقید کے آئینے میں دیکھا ہے اور ایک نہایت منفرد مقالہ ''مرزا غالب نقد و نظر کے آئینے میں'' رقم کیا ہے۔

تنقیدی مقالات کے علاوہ مولانا صلاح الدین احمد کے بعض سوانحی مضامین بھی بڑی وقعت رکھتے ہیں اور سوانح عمریوں پر اُن کی تنقید بھی بعض مضامین میں منفرد نکات اُٹھاتی ہے۔ سوانح عمری کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر ذات کو کائنات سے مِلا دینے کا نام ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''داستان گو اگر اپنی کہانی سناتے سناتے اپنی عہد کی کہانی سناتا ہے تو یہ اُس کے احساسِ تناسب کی ایک بہت بڑی شہادت ہے اور وہ سوانح نگار جذبۂ انانیت سے بھی کوسوں دُور ہے۔''(۲۹)

سوانحی مضامین میں سر سیّد، سر عبدالقادر اور قیوم نظر پر لکھے گئے اُن کے مضامین بہت عمدہ ہیں۔ سر سیّد کی سوانح عمری ''آبِ حیات'' کا تو مقدمہ بھی انھوں نے رقم کیا۔

سر سیّد اُن کے نزدیک شخصیت نہ تھے بلکہ ایک تحریک تھے۔ ایسی تحریک جو اقبال کی فکر اور جناح کے عمل کی صورت میں وسعت پذیر ہوئی۔ سر سیّد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''میری ناقص رائے میں لیڈر شپ کی اِس تاسیس و تخلیق کے بعد ملت کی حیاتِ ثانیہ کا جو خواب سر سیّد نے دیکھا تھا، اقبال کے تخیل اور جناح کے تدبیر کے طفیل وہ آخر کار پورا ہو کر رہا۔۔ آؤ اِس مصالحے سے

قصرِ زرنگار تعمیر کریں۔ ایک ایسا قصر جو سرسیّد کے خوابِ زرّیں کی ہو بہو تعمیر ہو۔۔۔"(۳۰)

قیوم نظر پر لکھے گئے سوانحی مضمون میں شخصیت سے اُن کی محبت اور بے تکلفی کا عنصر نمایاں ہے۔ اِس مضمون میں اُن کے تخلیقی سفر، مزاج اور مشاغل پر مولانا نے نہایت عمدہ انداز میں تبصرے کیے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"میں نے بہت سے حسین مناظر دیکھے ہیں۔ قدرتی بھی اور انسانی بھی لیکن قیوم کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سرخ سرخ ڈورے جو مئے ارغوانِ دِل سے تخلیق پاتے ہیں، میری دُنیائے حسن میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتے۔"(۳۱)

مولانا صلاح الدین احمد کے تراجم

مولانا صلاح الدین احمد کے قلمی آثار کی دوسری اہم جہت اُن کے تراجم ہیں۔ اِس سے قبل کہ اِن کا تجزیہ کیا جائے ذیل میں اُن کی ایک فہرست ملاحظہ ہو:

مقالات

طلاق کی نفسیاتی اہمیت	کملا دیوی چتوپادھیائے	ادبی دُنیا، لاہور	مئی ۱۹۳۹ء، ص۱۳
ہیگ کا قصرِ امن	آر۔ایم فاکس	ادبی دُنیا، لاہور	اکتوبر ۱۹۳۹ء، ص۹
قومی زبان کا مسئلہ	جواہر لعل نہرو	ادبی دُنیا، لاہور	مارچ ۱۹۴۹ء، ص۱۶۵

کتابیں

نیا گھر	ہرمن وینیا شنائڈر	مکتبہ فرینکلن، لاہور	۱۹۶۲ء
زندگی منزل بہ منزل	مس برتھا مورس پارکر	پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور	۱۹۶۲ء
بادل بارش اور برف	//	//	۱۹۶۲ء

توہمات یا سائنس	مس برتھا مورس پارکر	پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور	۱۹۶۲ء
سائنس دان اور اس کے آلات	//	//	//
زمین کی بدلتی ہوئی سطح	//	//	//
مادہ، سالمے اور جوہر	//	//	//
پودوں کے کارخانے	//	//	//
برق	//	//	//
زمانۂ قدیم کے جانور	//	//	//
حرارت	//	//	//
روشنی	//	//	//
آواز	//	//	//
کشش ثقل	//	نیو بک کمپنی، لاہور	۱۹۶۳ء
کیڑوں کی سماجی زندگی	//	//	//
مقناطیس	//	//	۱۹۴۷ء
مٹی	//	//	۱۹۴۳ء
انسانی مشین	//	یونائیٹڈ پبلشرز، لاہور	۱۹۶۲ء
پرندے	//	//	//
چاند	//	//	۱۹۶۲ء
ستاروں سے آگے	//	//	//
مشینیں	//	//	//
پھول، پھل اور بیج	//	//	//
موسم	//	//	۱۹۴۷ء
زندہ اشیا	//	//	۱۹۶۲ء

امریکہ کا سیاسی نظام	ڈیوڈ کشمن کویل	مطبوعات فرینکلن، لاہور
خدا ہمارے ساتھ ہے	اے۔ گریسی۔ مارین	// //

مذکورہ منثور تراجم کے علاوہ مولانا صلاح الدین احمد نے پرندرناتھ چٹوپادھیا کے ایک انگریزی ڈرامہ گاہ بھی ترجمہ کیا تھا، جو ''سنت تکارام'' کے عنوان سے ہے۔ بقول محمود احمد اسیر یہ ترجمہ انھوں نے ایک ہی رات میں کیا تھا۔[۳۰]

یہ ڈرامہ منظوم اور منثور دونوں پیرایوں میں ہے۔ مولانا نے اِس کے ترجمے میں ہندی تہذیب اور ہندی لفظیات کا بطورِ خاص اہتمام کیا ہے۔ مثلاً ایک انگریزی مکالمہ یوں ہے:

''My God is standing on my door step''

مولانا نے اِسی کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''پرمیشور کھڑا ہے میرے دوارے پر۔''[۳۱]

سنت تکارام کے علاوہ بقول عاتکہ صدیقی کے انھوں نے ٹیگور کی کسی نظم کا ترجمہ بھی کیا تھا جو دستیاب نہیں ہوسکا۔ البتہ مولانا حامد علی خاں نے اُس ترجمے سے ایک بند انھیں زبان سنایا جو ذیل میں درج کیا جارہا ہے:

اِس انتظار کے اب تو نہ میں سہوں گی ستم
کروں گی طے ترے سودا میں عرصۂ عالم
چمن میں دیکھ گلِ نو کی پشت ہو گی خم
ہوا کی چھیڑ سے گرتی ہیں پتیاں پیہم
ہمائے وقت اُڑا جا رہا ہے سوئے عدم

مذکورہ بند کا حوالہ غلام حسین اظہر نے بھی اپنے ایک مضمون میں دیا۔[۳۳]

موضوعاتی سطح پر مولانا صلاح الدین احمد کے منثور تراجم کو عاتکہ صدیقی نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔[۳۴]

۱۔	سائنسی	۲۔	سیاسی
۳۔	معاشرتی	۴۔	مذہبی

اُن کے سائنسی تراجم کو بھی دیکھیں تو وہ شعبے کے لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

حصہ اوّل: حیاتیات (Zoology)

۱۔ زمانۂ قدیم کے جانور
۲۔ کیڑوں کی جسمانی زندگی
۳۔ ہمارے جانے پہچانے جانور
۴۔ پرندے
۵۔ زندہ اشیا
۶۔ زندگی منزل بہ منزل

حصہ دوم: کیمیا (Chemistry)

۱۔ موسم
۲۔ ستاروں سے آگے
۳۔ مادہ، سالمے اور جوہر
۴۔ مٹی

حصہ سوم: طبیعیات (Physics)

۱۔ سائنس اور اس کے آلات
۲۔ حرارت
۳۔ مشین
۴۔ برق
۵۔ مقناطیس
۶۔ آواز
۶۔ روشنی
۸۔ توہمات یا سائنس
۹۔ بادل، بارش اور برف

حصہ چہارم : Human Physiology

۱۔ انسانی مشین
۲۔ پودوں کے کارخانے
۳۔ پھل، پھول اور بیج

مولانا صلاح الدین احمد کے منثور تراجم کا تنقیدی تجزیہ کیا جائے تو اوّلین وصف تہذیبی فضا کا سامنے آتا ہے۔ وہ محض الفاظ کا ترجمہ نہیں کرتے بلکہ اُس فضا میں ایک ایسا رنگ بھرتے ہیں کہ متن پر غیریت کا احساس نہیں ہوتا۔ اِس کے علاوہ اگر کوئی عنصر مشرقی تہذیب سے متصادم ہوتو اُسے بڑی چابک دستی سے غائب کر دیتے ہیں۔

ترجمے کے دوران میں مولانا اس کی تبدیلی کو بھی روا خیال کرتے ہیں۔ یعنی اصل متن کے مغربی اور نامانوس ناموں کو مشرق کے دیکھے بھالے ماحول کے مطابق نام بدل لیتے ہیں۔

اسلوب کی سطح پر وہ اپنی انشا پردازی کا سحر بیاں بھی برقرار رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی طبع زاد نثر کی طرح کے پھول نہیں کھلاتے کہ ترجمے کی صحت کو بھی وہ عزیز رکھتے ہیں۔

اُن کے تراجم کی بیشتر نوعیت چونکہ سائنسی، تحقیقی اور معلوماتی نوعیت کی ہے لٰہذا وہ اپنے ترجمی کو رواں دواں، سہل اور پرکشش بناتے ہیں۔ اِن تراجم میں عام گفتگو، تفہیمی انداز اور سلیس پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ اُن کے نزدیک مقصد عمدہ اور پراثر ابلاغ رہا ہے تاکہ قاری بڑھتے ہوئے کسی ابہام کا شکار نہ ہو۔

مولانا صلاح الدین احمد کسی کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنے قاری کی سماجی حیثیت، شعبہ اور علمی استعداد کو بھی سامنے رکھتے تھے۔ اگر کوئی کتاب بچوں کے لیے ترجمہ کی جارہی ہوتو اُن کا اندازِ تحریر نہ صرف سلیس ہوتا بلکہ بچوں کی دلچسپی اور نفسیات کے بھی عین مطابق ہوتا۔

اُن کے تراجم میں بعض اوقات ایسی روانی اور سحر پیدا ہو جاتا ہے کہ قاری کو طبع زاد تحریر کا گمان ہونے لگتا ہے، یعنی ایسا نہیں لگتا کہ اس متن کا تعلق کسی غیر زبان سے بھی ہوگا۔

ذیل میں چند اقتباسات بطورِ مثال پیش کیے جارہے ہیں، تاکہ اُن کے ترجمے اور اصل متن کو سامنے رکھتے ہوئے قارئین اُن کے اوصافِ ترجمہ کا خود مشاہدہ کر پائیں۔

برتھا مورس پارکر کی تصنیف ''Clouds, Rain and Snow'' سے ایک اقتباس ہے:

"One day John's mother asked him to go to the window and see whether the sky was cloudy or

clear. John looked and then said, "It isn't cloudy, and it isn't clear."
"It must be one or the other, "his mother said. "Is the sun shining?"
"No," Said John.
"Can you see any blue sky." asked his mother.
"No." John asnswered.
"Then there must be some clouds."(35)

مولانا صلاح الدین احمد نے اِس کتاب کو ''بادل، بارش اور برف'' کا عنوان دیا ہے یاور نے متذکرہ اقتباس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''ایک دِن خلیل کی امی جان نے اس سے کہا کہ ذرا کھڑکی سے جھانک کر دیکھنا بادل چھا رہے ہیں یا آسمان بالکل صاف ہے۔ خلیل نے کھڑکی میں سے جھانکا اور واپس آ کر کہنے لگا۔ ''امی جان آسمان نہ تو صاف ہے، نہ وہاں کوئی بادل ہی ہے۔''
یہ جواب اس کی امی کی سمجھ میں نہ آیا اور وہ کہنے لگیں کہ ''دونوں میں سے ایک بات تو ضرور ہونی چاہیے، کیا سورج چمک رہا ہے؟
''نہیں تو''، خلیل نے جواب دیا۔
''تو کیا تمھیں کہیں کہیں سے آسمان نیلا نظر آ رہا ہے؟''
''نہیں، بالکل نہیں۔''
''تو پھر کچھ بادل ضرور ہوں گے۔''(۳۶)

برتھا مورس پارکر کی ایک اور تصنیف 'Birds' کا ایک اقتباس یوں ہے:

"Nancy and John were making up riddles for each other."
"Here is one, "John said. I am thinking of an animal. It has a backbone. It has two lkegs. It

has wings. It is almost all red, but it has some black, on it. There is a topknot on its head. What is it?"

"I give up," Nancy said at once, "I don't think your riddle is a good one. I don't think there is any red animal that has wings."

"Oh, yes, there is, "John told her. "The animal I am thinking of is a cardinal, or red-bird. Birds, you know, are animals."

John was right. Birds are animals. Everything alive that is not a plant is an animal. A red-bird is an animal just as a butterfly or a cat or a frog or an elephant is."(37)

مولانا صلاح الدین احمد تصنیف ''پرندے'' کا عنوان دیا ہے اور متذکرہ اقتباس کا ترجمہ اِس طرح کرتے ہیں:

''سلیم اور سلمیٰ آپس میں پہیلیاں کہہ رہے تھے۔ سلیم نے کہا'' بھلا وہ کون سا حیوان ہے جس کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں، ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے، پر بھی ہوتے ہیں اور رنگ سَر سے پاؤں تک سرخ ہوتا ہے اور ہاں اس کے سَر پر ایک کلغی بھی ہوتی ہے اور بدن کا تھوڑا سا حصہ کالا بھی ہوتا ہے۔

سلمیٰ فوراً بول اُٹھی، ہم ہارے! مگر تمھاری یہ پہیلی ہے ہی غلط۔ بھلا وہ کون سا حیوان ہوسکتا ہے جس کے پر بھی ہوں، ''ہاریں!'' سلیم نے جواب دیا، ''وہ حیوان ہے، شاہ سرخ، یعنی بڑا لال، کیا پرندے حیوان نہیں ہوتے؟'' سلیم ٹھیک کہتا تھا، پرندے بھی حیوان ہوتے ہیں۔ ہر وہ زندہ چیز جو پودا نہیں ہے، حیوان ہی تو ہے، لال یا سرخ بھی اسی طرح کا ایک حیوان ہے جس طرح کی حیوان ایک تتلی ہے یا ایک بلی یا ایک مینڈک یا

ایک ہاتھی، یہ سب حیوان ہیں اور ہم انسان بھی تو حیوان ہی ہیں۔‘‘[۳۸]

اپنی تصنیف ’Birds‘ میں برتھا مورس پارکر ایک اور جگہ لکھتی ہیں:

"There are thousands of different kinds of birds. There are more than 750 kinds in our own country. These belong to many different bird families. Three of the families almost everyone in our country knows about are the woodpecker family, the thrush family, and the blackbird family."[39]

متذکرہ بالا اقتباس کا ترجمہ مولانا صلاح الدین احمد کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:

’’دُنیا بھر میں پرندوں کی یوں تو ہزاروں قسمیں ہیں لیکن ہر بڑے ملک میں ان میں سینکڑوں قسمیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ ان سینکڑوں قسموں سے بیسیوں چھوٹے چھوٹے خاندان بنتے ہیں اور پھر یہ چھوٹے چھوٹے خاندان چند بڑے خاندانوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ان بڑے خاندانوں میں ہدہد کا خاندان، توتی کا کنبہ اور کستورے اور کلچڑی کا قبیلہ زیادہ مشہور ہیں۔‘‘[۴۰]

برتھا مورس پارکر کی ایک اور کتاب ’’The earth changing surface‘‘ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"Not long ago a geologist found an interesting boulder in the mestern mountains. He was not sure of what kind of rock the boulder was made. He wanted to take a small specimen back with him, but although he had a hammer, he could not break off a piece."[41]

اس کا ترجمہ مولانا نے یوں کیا ہے:

''کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک ایسے ہی عالم کو امریکہ کی مغربی پہاڑیوں میں ایک بہت بڑا پتھر مِلا۔ اسے یقینی طور سے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ پتھر کس قسم کے سنگین مادے سے بنا ہے۔ وہ اپنے ساتھ اس کا ایک ٹکڑا نمونے کے طور پر لے جانا چاہتا تھا اور اگرچہ اس کے پاس ایک بڑا سا ہتھوڑا بھی تھا اور اسے اس نے خوب استعمال بھی کیا مگر وہ اس پتھر میں سے ایک کنکر بھی جدا نہ کرسکا۔''(۴۲)

اِسی کتاب میں ایک اور جگہ برتھا مورس پارکر لکھتی ہیں:

"In Word War II when the Japanese armies came into China, the Chinese saw a way of using the Hwang Ho to help protect their country. They made the river flow again on its old course to the sea. The Japanese could no longer use it as a highway down from the north and it barred the way to a part of the country that the Japanese had not yet reached. But shortly after the war was over the Chinese to save farms that were flooded shifted the river once more to the northward course it made for itself in 1852."(43)

مولانا صلاح الدین احمد نے برتھا مورس پارکر کی موضوع بحث تصنیف کا ترجمہ ''زمین کی بدلتی ہوئی سطح'' کے عنوان سے کیا اور مذکورہ اقتباس کو اُردو کا رُوپ اِن الفاظ میں دیا:

''دُنیا کی دوسری بڑی جنگ میں جب جاپانی فوجوں نے چین پر حملہ کیا تو چینیوں نے انھیں سمندر کی طرف سے دریائے ہوانگ ہو کی دہانے میں داخل ہونے نہیں دیا۔ وہ اس طرح کہ انھوں نے دریا کے بڑے رخنے کو بند کر کے اسے پھر سے اپنے پرانے راستے پر ڈال دیا۔ بعض جاپانی جہاز

جو ہوانگ ہو کے دہانے تک آ چکے تھے، پانی کی بجائے دلدل میں پھنس
گئے اور بعض واپس چلے گئے، لیکن جب جنگ ختم ہوگئی تو چینیوں نے دریا
کا نیا راستہ پھر سے کھول کر اردگرد کی زمینوں کو سیلاب میں غرق ہونے
سے بچالیا۔''(۴۴)

''ادبی دُنیا'' کے اداریے، تنقیدی شذرات، تبصرے، تلخیصات

مولانا صلاح الدین احمد کے قلمی آثار کی چوتھی اور آخری جہت اُن کے مجلّہ ''ادبی دُنیا'' کے اداریے، نیز اس کے بعض شماروں میں اُن کے تنقیدی شذرات اور تبصرے و تلخیصات ہیں۔

''ادبی دُنیا'' کا اداریہ وہ ''بزمِ ادب'' کے ایک مستقل عنوان سے رقم کرتے تھے نیز اداریے کے موضوع کے پیشِ نظر ہر اداریے پر اُس کا خاص عنوان بھی درج کرتے تھے۔ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۶ء انھوں نے ''ادبی دُنیا'' کے اداریے جن عنوانات کے تحت رقم کیے، اُن کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو:

آہ! منصور	مئی ۱۹۳۷ء	ص ۴۸۶
ماتمِ منصور	جون ۱۹۳۷ء	ص ۵۴۸
سالنامہ ''ادبی دُنیا''	اکتوبر ۱۹۳۷ء	ص ۸۱۶
سالنامے کی ایک جھلک	نومبر ۱۹۳۷ء	ص ۸۸۰
سالنامے کے مضامین کا تعارف	جنوری ۱۹۳۸ء	ص ۷
میر افضل علی اور وحید گیلانی کی وفات پر تعزیتی شذرہ	فروری ۱۹۳۸ء	ص ۳۰۴
علامہ اقبال مرحوم	مئی ۱۹۳۸ء	ص ۴۹۹
نئے مصنّفین	نومبر ۱۹۳۸ء	ص ۹
''گرم کوٹ'' از بیدی کا تعارف	فروری ۱۹۳۹ء	ص ۹
شیخ عبدالقادر۔ میراجی کے مضامین اور اوپندر ناتھ اشک کے افسانے کا تعارف	مارچ ۱۹۳۹ء	ص ۷

اُردو ادب اور خلیل جبران	اپریل ۱۹۳۹ء	ص ۷
طلاق کی نفسیاتی اہمیت	مئی ۱۹۳۹ء	ص ۷
ابوالفضل صدیقی کے افسانے	مارچ ۱۹۴۱ء	ص ۹
سر شاہ محمد سلیمان کی وفات	اپریل ۱۹۴۱ء	ص ۹
دربارِ آصفی میں ایک اُردو رسالے کا ایڈیٹر	مئی ۱۹۴۱ء	ص ۹
رشک کا افسانہ ''بینگن کا پودا''	جون ۱۹۴۱ء	ص ۷
عسکری کا افسانہ چائے کی پیالی	جنوری ۱۹۴۲ء	ص ۷
جنگ اور ادب	فروری ۱۹۴۲ء	ص ۷
ادبی دُنیا کا نیا سائز	مارچ ۱۹۴۲ء	ص ۷
چند افسانہ نگار	اپریل ۱۹۴۲ء	ص ۷
ادبی دُنیا کے پانچ افسانے	جولائی ۱۹۴۲ء	ص ۷
کاغذ کی نایابی اور ''ادبی دُنیا''	دسمبر ۱۹۴۲ء	ص ۷
''اُردو بولو'' کانفرنس	جولائی ۱۹۴۳ء	ص ۷
''آرٹ اور فلسفہ''	اگست ۱۹۴۳ء	ص ۷
پنجاب کی قومی زبان کا مسئلہ	ستمبر ۱۹۴۳ء	ص ۷
اُردو شاعری میں جنسیات	اکتوبر ۱۹۴۳ء	ص ۷
پنجاب اُردو کانفرنس	نومبر ۱۹۴۳ء	ص ۶
کل ہند اُردو کانفرنس، ناگ پور	جنوری ۱۹۴۴ء	ص ۶
مدارس میں اُردو کا درجہ	فروری ۱۹۴۴ء	ص ۶
پنجاب یونیورسٹی اور اُردو	مارچ ۱۹۳۴ء	ص ۷
اُردو کانفرنس کا اِلتوا	اپریل ۱۹۴۴ء	ص ۷

محمد علی رودولوی کا افسانہ ''یہ جنس''	مئی ۱۹۴۴ء	ص ۷
اُردو یونیورسٹی	جولائی ۱۹۴۴ء	ص ۷
اقبال کی شاعرانہ عظمت	اگست ۱۹۴۴ء	ص ٦
خوشی محمد ناظر کی وفات	ستمبر ۱۹۴۴ء	ص ٦
شمس آغا کے افسانے	اکتوبر ۱۹۴۴ء	ص ٦
گفتنی نا گفتنی	نومبر ۱۹۴۴ء	ص ۱۰
آغا بابر کا افسانہ ''زندگی کی شام''	فروری ۱۹۴۵ء	ص ٦
راجہ زیندر ناتھ کی وفات	مارچ ۱۹۴۵ء	ص ٦
غزل ــــ جوش کی نظر میں	اپریل ۱۹۴۵ء	ص ۱۴
''شعر العجم''	مئی ۱۹۴۵ء	ص ۱۴
ترقی پسند ادب	جون ۱۹۴۵ء	ص ۱۴
ہندی سہاتیہ منڈل	جولائی ۱۹۴۵ء	ص ۱۴
محمد دِین فوق کی وفات	ستمبر ۱۹۴۵ء	ص ۱۳
اُردو بولو تحریک	نومبر ۱۹۴۵ء	ص ۱۵
ناسخ اور آتش	دسمبر ۱۹۴۵ء	ص ۱۴
گاندھی اور اُردو	جنوری ۱۹۴٦ء	ص ۱۱
محمود شیرانی کی وفات	فروری ۱۹۴٦ء	ص ۲۳
مسعود شاہد۔ افسانہ نگار	مارچ ۱۹۴٦ء	ص ۱۹
سرکاری مسلوں میں ہندی	اپریل ۱۹۴٦ء	ص ۱۳
بی اے کے اِمتحان میں اُردو	مئی ۱۹۴٦ء	ص ۱۴
اشفاق احمد۔ ایک نیا افسانہ نگار	جون ۱۹۴٦ء	ص ۱۳

ایچ جی ویلز کی موت پر	جولائی ۱۹۴۶ء	ص۱۴
اندر جیت شرما کی موت	اگست ۱۹۴۶ء	ص۱۴
ریڈیو پر ''آداب عرض''	ستمبر ۱۹۴۶ء	ص۱۴
محمد عمر کی وفات پر	اکتوبر ۱۹۴۶ء	ص۱۴
ذریعہ تعلیم کی تبدیلی	نومبر ۱۹۴۶ء	ص۱۴
انجمن ترقئ اُردو کا وظیفہ	دسمبر ۱۹۴۶ء	ص۱۴
انجمن کے لیے سرکاری سرپرستی	جنوری ۱۹۴۷ء	ص۱۴
ریڈیو سے اُردو کا اخراج	فروری ۱۹۴۷ء	ص۱۴
فرحت اللہ بیگ کی وفات پر	مارچ ۱۹۴۷ء	ص۱۴
ہندوستان کی سرکاری زبان	اپریل/مئی ۱۹۴۷ء	ص۱۴
تنم سوخت، دلم سوخت، استخوانم سوخت	جولائی ۱۹۴۷ء	ص۱۴
''ادبی دُنیا'' کا دورِ جدید	دسمبر ۱۹۴۸ء	ص۹
قاضی سلطان پوری کے افسانے	فروری ۱۹۴۹ء	ص۱۱
سرتیج بہادر سپرو کی موت	مارچ ۱۹۴۹ء	ص۱۱
ٹوٹا ہوا تارہ	مئی ۱۹۴۹ء	ص۱۳
اُردو اکیڈمی کی تجویز	جولائی ۱۹۴۹ء	ص۱۱
فنون کی تعلیم کے لیے انگریزی ضروری ہے؟	اکتوبر ۱۹۴۹ء	ص۱۱
ہندوستان میں اُردو روبہ زوال ہے؟	نومبر ۱۹۴۹ء	ص۱۱
میرا جی کی وفات	دسمبر ۱۹۴۹ء	ص۵
	جنوری ۱۹۵۰ء	ص۵
مشاعرے	فروری ۱۹۵۰ء	ص۳

شیخ عبدالقادر کی رحلت	مارچ ۱۹۵۰ء	ص۵
اقبال اکیڈمی	مئی ۱۹۵۰ء	ص۳
خوابِ ہستی	جولائی ۱۹۵۰ء	ص۳
دارالمصنّفین کا منصوبہ	مئی ۱۹۵۰ء	ص۵
نستعلیق رسم الخط	اگست ۱۹۵۰ء	ص۳
ستمبر کا ستم گر مہینہ	اکتوبر ۱۹۵۰ء	ص۳
''ادبی دُنیا'' کی تین ماہ کی تاخیر	فروری ۱۹۵۱ء	ص۵
اُردو کے سنجیدہ رسائل	جولائی ۱۹۵۲ء	ص۳
ڈاکٹر رشید جہاں	نومبر ۱۹۵۲ء	ص۱۵
عالمی افسانے کے تراجم	جون ۱۹۵۳ء	ص۵
میٹرک میں ریاضی کی تعلیم اور انگریزی	اگست ۱۹۵۳ء	ص۴
وزیر آغا اور نئے تقاضے	اکتوبر ۱۹۵۳ء	ص۳
اکادمی پنجاب کی کتابیں	دسمبر ۱۹۵۳ء	ص۵
اکادمی پنجاب کا پروگرام	جنوری ۱۹۵۴ء	ص۵
زبان کا مسئلہ	فروری ۱۹۵۴ء	ص۵
انتخابات اور اُردو	مارچ ۱۹۵۴ء	ص۵
جی ایم سیّد اور اُردو	اپریل ۱۹۵۴ء	ص۷
تیسرے دور کا پہلا شمارہ	مئی ۱۹۵۴ء	ص۱۵
منٹو اور اُردو افسانہ	جنوری ۱۹۵۵ء	ص۳
اکادمی کی مطبوعات	فروری ۱۹۵۵ء	ص۵
مغربی پاکستان اور اُردو	مارچ ۱۹۵۵ء	ص۵

گیانی کرتار سنگھ اور اُردو		اپریل ۱۹۵۵ء	ص۵
اخبار کے ادبی ایڈیشن		مئی ۱۹۵۵ء	ص۵
حسرت کی وفات		جون ۱۹۵۵ء	ص۶
خواجہ حسن نظامی کی وفات		جولائی ۱۹۵۵ء	ص۵
مظلوم زبانِ اُردو		اگست ۱۹۵۵ء	ص۵
خلیفہ شجاع الدین کی وفات		ستمبر ۱۹۵۵ء	ص۵
کیفی کی موت		اکتوبر ۱۹۵۵ء	ص۵
سیّد علی منظور کی وفات		نومبر ۱۹۵۵ء	ص۵
قاضی عبدالغفار کی وفات پر تعزیتی شذرہ		جنوری ۱۹۵۶ء	ص۵
اورینٹل کالج کی سالگرہ		فروری ۱۹۵۶ء	ص۶۵
مانگے کی روشنی		فروری ۱۹۵۶ء	ص۱
مکتبہ فرینکلن کے منتظم کلیم صاحب		مارچ ۱۹۵۶ء	ص۵
رضا علی وحشت		اپریل ۱۹۵۶ء	ص۵
تعلیمی ضروریات کے لیے کاغذ		مئی ۱۹۵۶ء	ص۵
ادبی دُنیا کا پانچواں دور	ادبی دُنیا خاص	شمارہ اوّل	ص۵
قطرہ دریا آشنا		شمارہ دوم	ص۵
جگر مرادآبادی کی وفات		شمارہ ۳	ص۵
باعثِ تاخیرِ اشاعت		شمارہ ۴	ص۵
مختصر افسانے کا دورِ زرّیں		شمارہ ۵	ص۵
مختصر افسانے کے دورِ زرّیں کی وضاحت		شمارہ ۶	ص۵
حمید نظامی کی وفات پر		شمارہ ۷	ص۶

مرزا محمد سعید دہلوی	شمارہ۸	ص۶
ڈاکٹر زور	شمارہ۹	ص۶
افسانے کی نئی آواز۔فضل الرحمٰن	شمارہ۱۰	ص۸
ادبی دُنیا کی جنوں ساماں روش	شمارہ۱۱	ص
اُردو۔ایک یتیم بچہ	شمارہ۱۲	ص

مولانا صلاح الدین احمد کے رقم کردہ مذکورہ اداریوں کا جائزہ لیں تو یوں محسوس ہوتا ہے، گویا وہ ایک ادبی تاریخ کے تسلسل میں ایک موجِ رواں کی مانند ہیں۔ادب کی تازہ تر صورتِ حال پر ایک گہری نظر رکھتے ہوئے ایک متحرک اور مہذب مبصر کی طرح اپنی رائے کا اظہار کر رہے ہیں۔

اُردو زبان کے مسائل، ادیبوں کے مسائل، اُن کی تازہ تر تخلیقات اور تصنیفات، ادبی اصناف کے ہیئتی مسائل، نئے اہلِ قلم کے ذہنی رجحانات، معاصر حالات کے اُردو ادب پر اثرات، اُردو شاعری کے فکری و فنی مسائل، ادبی تحاریک کے رجحانات، مسائل اور اثرات، ذرائع ابلاغ اور ادب، ادبی ادارے اوزان کے مسائل اور اہلِ سیاست کے اُردو زبان کے بارے میں خیالات۔یہ وہ متنوع موضوعات ہیں، جن پر وہ نہایت بے باکانہ انداز میں لکھتے تھے۔اِس کے علاوہ اُن کے اسلوب میں دانش کا عنصر بھی معاصر اہلِ قلم کو متاثر کرتا رہا۔بقول سیّد ضمیر جعفری:

> ''ادبی دُنیا کے اداریے پڑھیں تو مسرت اور بہجت کا گویا دبستان کھل جاتا ہے۔مولانا صلاح الدین ادبا اور اُن کی تخلیقات کا تعارف جس والہانہ شیفتگی سے کراتے اور اُن کے مضامین پر جو خیال انگیز شذرے لکھتے تھے۔انھی کا نتیجہ تھا کہ یہ ادبا ادب کے مستقل باسی بن جاتے تھے۔چناں چہ اب یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مخزن کی طرح ادبی دُنیا نے اپنے زریں ادوار اشاعت میں تخلیقی ادیبوں کے انبوہِ کثیر کو منظرِ عام پر لانے کی کاوش شاید سب سے زیادہ کی اور مدیر اور ادیب کے امتیاز کو یک

سر ختم کر دیا۔''(۴۵)

مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے اداریوں میں اہلِ قلم کی وفیات کو بطورِ خاص اہمیت دی۔ وہ کسی ادیب کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے سانحے کو ذاتی طور پر محسوس کرتے تھے اور اُس خلا کو بھی دیکھتے جو اُس کے جانے سے پیدا ہوتا، منصور احمد، سرشار، محمد سلیمان، خوش محمد ناظر، محمود شیرانی، ایچ جی ویلز، اندر جیت شرما، فرحت اللہ بیگ، سر تیج بہادر سپرو، شیخ عبدالقادر، حسرت موہانی، خواجہ حسن نظامی، خلیفہ شجاع الدین، کیفی، سیّد علی منظور، قاضی عبدالغفار، جگر مراد آبادی اور حمید نظامی کی وفات پر ان کے لکھے گئے تعزیتی اداریے ایک دلِ دردمند کے حرفِ سپاس ہیں۔

بقول محمود احمد اسیر:

> ''قومی دردمندی کا جذبہ اور نقصانِ عظیم کا غم اُن کے قلم کو متحرک کر دیتا اور پھر وہ جو تعزیت نامہ لکھتے اس میں اُن کا سارا جذبۂ الم سمٹ آتا اور پھر یہ کرب و الم اِس پیمبری وقت میں بھی اسلوب و بیاں کے وہی جادو جگاتا، جو اُن کی طبیعت کا خاصا تھا۔''(۴۶)

ادبی دُنیا میں اداریے کے علاوہ مولانا صلاح الدین احمد مختلف حوالوں سے تنقیدی شذرہ بھی رقم کرتے۔ اگرچہ یہ سلسلہ کوئی مستقل نہیں تھا۔ وہ اپنے تنقیدی شذرے کو ''کہنے کی باتیں'' کا عنوان دیتے۔ مذکورہ تنقیدی شذروں کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو:

صحافتی دیانت داری	ادبی دُنیا، لاہور	جنوری ۱۹۴۴ء	ص ۴۹
اُردو کانفرنس	// //	فروری ۱۹۴۴ء	ص ۴۱
کہنیا لعل کا ایک مضمون	// //	مارچ ۱۹۴۴ء	ص ۴۱
''اہلِ زبان''	// //	اپریل ۱۹۴۴ء	ص ۵۱
صحافت میں فحاشی	// //	مئی ۱۹۴۴ء	ص ۵۱
رسالہ ''نیا ادب''	// //	جولائی ۱۹۴۴ء	ص ۵۹

''جرم وسزا''	ادبی دُنیا، لاہور	اگست ۱۹۴۴ء	ص ۶۰
رسالہ ''منادی'' اور حسن نظامی	// //	ستمبر ۱۹۴۴ء	ص ۴۷
محمد حسن عسکری	// //	اکتوبر ۱۹۴۴ء	ص ۶۵
مسلم ایجوکیشنل کانفرنس	// //	نومبر ۱۹۴۴ء	ص ۵۹
اقبال کی یادگار	// //	مئی ۱۹۴۹ء	ص ۱۴۲

مولانا صلاح الدین احمد اگر چہ تازہ تر تصنیفات کو اداریوں میں بھی موضوع بناتے تھے اور اپنے بعض تنقیدی مضامین میں بھی ذیلی طور پر تازہ کتابوں کا ذِکر آ جاتا تھا لیکن بعض کتابوں کی اہمیت کے پیشِ نظر اُن پر بھر پور تبصرہ کرنا بھی مولانا صلاح الدین احمد اپنی صحافتی ذمہ داری سمجھتے تھے۔

اُن کا ہر تبصرہ وسعتِ فکر، وسعتِ تحریر اور جامعیت کی صفات رکھتا تھا۔ ذیل میں اُن کے تبصروں کی فہرست ملاحظہ ہو:

طلسمِ خیال	کرشن چندر	ادبی دُنیا، لاہور	جنوری ۱۹۴۹ء	ص ۷۷
پاگل	بشیر ہندی	//	// فروری ۱۹۳۹ء	ص ۷۹
نذرِ ولی	طالبات جامعہ عثمانیہ کی مرتبہ کتاب //	//	مارچ ۱۹۳۹ء	ص ۷۶
یادگارِ ولی	مرتبہ سیّد محمد ایم اے	// //	// //	//
افکارِ سلیم	وحیدالدین سلیم	//	// جولائی ۱۹۳۹ء	ص ۷۷
کونپل	اوپندر ناتھ اشک	//	// جون ۱۹۴۱ء	ص ۶۵
ہوائی قلعے	کرشن چندر	// //	// //	ص ۶۷
گناہوں کا خوف	چودہری محمد علی ردولوی	//	// مارچ ۱۹۴۲ء	ص ۴۷
ماورا	ن ۔م۔ راشد	// //	// //	ص ۴۸
راہ گزر	عاشق حسین بٹالوی	//	// دسمبر ۱۹۴۲ء	ص ۷۱
اعمال نامہ	سر رضا علی	//	// مارچ ۱۹۴۴ء	ص ۴۳

خوں بہا	کلیم احمد شجاع	ادبی دُنیا، لاہور	مارچ ۱۹۴۴ء	ص ۴۴
چند ہم عصر	مولوی عبدالحق	// //	اپریل ۱۹۴۴ء	ص ۵۴
ہماری گلی	احمد علی	// //	مئی ۱۹۴۴ء	ص ۵۳
زنداں	یوسف ظفر	// //	جولائی ۱۹۴۴ء	ص ۶۰
اقبال نامہ	شیخ عطاء اللہ	// //	نومبر ۱۹۴۴ء	ص ۶۱
شکست	کرشن چندر	// //	اگست ۱۹۴۳ء	ص ۶۵
اَن کہی	ممتاز مفتی	// //	اکتوبر ۱۹۴۳ء	ص ۶۵
شیش محل	شوکت تھانوی	// //	// //	ص ۶۷
تار و پود	بلونت سنگھ	ادبی دُنیا، لاہور	نومبر ۱۹۴۵	ص ۸۱
قندیل	قیوم نظر	// //	// //	ص ۸۲
مضراب	راجہ مہدی علی خان	// //	دسمبر ۱۹۴۵ء	ص ۱۹۵
یادِ ایام	عبدالرزاق کان پوری	// //	دسمبر ۱۹۴۷ء	ص ۱۶۱
تصوف اور اُردو شاعری	سیّد صفی حیدر	// //	نومبر ۱۹۴۹ء	ص ۱۶۹
مسلمانوں کا علم جغرافیہ		// //	مارچ ۱۹۴۹ء	ص ۱۷۱
سرودِ نو	تصدق حسین خالد	// //	// //	ص ۲۳۵
روزگارِ فقیر	فقیر سیّد وحید الدین	اشاعتِ خاص	۱۹۵۱ء	ص ۲۳۹
یادگارِ فرحت	مرتبہ غلام یزدانی	// //	// //	ص ۲۴۲
لمحاتِ جاوداں	ہادی حسین	// //	// //	ص ۲۴۲
شعرائے اُردو کے تذکرے	ڈاکٹر سیّد عبداللہ	// //	نومبر ۱۹۵۲ء	ص ۸۱
کمار سمبھو	کالی داس (منظوم ترجمہ منور لکھنوی)	// //	// //	ص ۸۳
تذکرہ شعرائے اُردو	نظیر حسین خان لدھیانوی	// //	اکتوبر ۱۹۵۳ء	ص ۸۱

ادبیاتِ سرحد (جلد اوّل)	رضا ہمدانی	اشاعتِ خاص	اکتوبر ۱۹۵۳ء	ص ۸۵
سرگزشت	عبدالمجید سالک	// //	مئی ۱۹۵۵ء	ص ۵۹
اقبال لاہوری	مجتبیٰ مینوی	// //	جولائی ۱۹۵۵ء	ص ۵۹
نئی تحریریں	حلقہ اربابِ ذوق، لاہور	// //	// //	ص ۶۱
سیّد احمد شہید	مولانا غلام رسول مہر	// //	اکتوبر ۱۹۵۵ء	ص ۵۷
ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک	// //	جنوری ۱۹۵۶ء	ص ۷۵
دمِ نیم سوز	صدیق کلیم	// //	// //	ص ۷۹
نہج البلاغہ	حضرت علیؓ (ترجمہ رئیس احمد جعفری)	// //	اپریل ۱۹۵۶ء	ص ۶۳
ہزار داستان	ریاض شاہد	// //	// //	ص ۶۴
گفتنی ناگفتنی	شورش کاشمیری	// //	// //	ص ۶۶
الزہرا	عمر ابوالنصر (ترجمہ محمد احمد پانی پتی)	// //	// //	ص ۶۸
حسرت کے مضامین	مرتبہ ظہیر الحسن جاوید	// //	// //	ص ۷۰
اقبال کے آخری دو سال	عاشق حسین بٹالوی	ادبی دُنیا، لاہور	خاص شمارہ ۶	ص ۲۹۳
اُردو ادب میں فنِ سوانح نگاری کا ارتقا	الطاف فاطمہ	// //	// //	ص ۲۹۴
جلوس (ناول)	شیخ حمید	// //	// //	ص ۲۹۵
قدیم علوم اور جدید تہذیب	جارج سارٹن (ترجمہ ہاشمی فرید آبادی)	// //	// //	ص ۲۹۶
مقالاتِ یومِ شبلی	مرتبہ شیخ عطاالله	// //	// //	ص ۲۹۷
محسنِ اعظم اور محسنین	فقیر وحید الدین	// //	شمارہ ۱۲	ص ۲۸۵
خیام	عشرت رحمانی	// //	// //	ص ۲۰۸
پنجابی قصے فارسی زبان میں	ڈاکٹر محمد باقر	// //	// //	ص ۲۰۹

مولانا صلاح الدین احمد کی تبصرہ نگاری میں زیرِنظر کتاب کا ایسا ریویو شامل ہوتا تھا، جس میں پوری کتاب کا ایک جامع عکس آ جاتا تھا۔اُن کے تبصرے کو پڑھ کر یہ لگن ضرور پیدا ہوتی کہ کتاب کا مطالعہ کیا جائے۔اِس کے علاوہ وہ تصنیف کے ساتھ ساتھ صاحبِ تصنیف کا بھی عکس اپنے تبصرہ میں دِلکش انداز میں اُتارتے۔اُن کی تبصرہ نگاری پر ڈاکٹر انور سدید نے بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے۔اُن کے نزدیک:

> ''مولانا پہلے مصنف کا تعارف کچھ ایسے جذباتی انداز میں کراتے کہ مصنف کی شخصیت کا ایک خوبصورت نقش آپ کے دِل پر مرتسم ہو جاتا ہے اور آپ مصنف سے ملاقات کی مسرت حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔''(۴۷)

اگرچہ مصنف کے تبصرے میں مصنف پر تبصرہ کوئی صحت مند رویہ نہیں لیکن مولانا صلاح الدین احمد کی توجہ زیادہ تر مصنف کے علمی پس منظر پر ہوتی تھی۔گویا وہ قاری کو تصنیف کی اہمیت قاری کی علمیت کے تناظر میں بتا کر کتاب کی اہمیت کو دوچند کرتے۔

مولانا صلاح الدین احمد کا تبصرہ بہت واضح اور محاسن و معائب پر متوازن اندازِ نظر کا حامل ہوتا تھا۔وہ جہاں ضروری سمجھتے کتاب کے عیوب پر بلا جھجک لکھتے حُسنِ نیت کے ساتھ بات کرتے۔اِس طرح جہاں کتاب کا حسن سامنے آتا تو خوب حوصلہ افزائی کرتے۔

مولانا صلاح الدین احمد کے قلمی آثار کا ایک خاص عنصر وہ تلخیصات کا وہ سلسلہ ہے، جو اُن کے ادبی مجلّے ''ادبی دُنیا'' کے بعض شماروں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔اِسی سلسلے کے تحت وہ اُردو کے معاصر ادبی رسائل میں شائع ہونے والے مقالات، مضامین، تراجم اور افسانوں کا خلاصہ پیش کرتے تھے۔اورینٹل کالج میگزین، جامعہ، زمانہ، ادبِ لطیف، دِلگداز، سب رس، کلیم، معارف، نگار، داستان، ساقی، نیرنگِ خیال، اضطراب اور معاصر ایڈ سے اہم رسائل کے متعدد تنقیدی مقالات اور تخلیق بارے ایسے ہیں، جن کی تلخیص انھوں نے ''ادبی دُنیا'' میں شائع کی۔

یوں ''ادبی دُنیا'' کی وسعت میں بھی اضافہ ہوا اور انھوں نے معاصر ادبی صحافت کے اندر ایک باہمی ارتباط کا بھی رستہ کشادہ کیا۔

مولانا صلاح الدین احمد کی مذکورہ تلخیصات کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین		ادبی دُنیا، لاہور	جون ۱۹۳۹ء	ص ۶۷
شیکسپیئر کے چند بند کا ترجمہ	عابد نواز جنگ	اُردو	جنوری تا مارچ	۱۹۳۹ء
بسمل فیض آبادی اور اودھ کی قدیم ترین مثنوی	عبدالباری آسی	اُردو	ایضاً	
محمد حسین آزاد	آغا محمد باقر	اورینٹل کالج میگزین	فروری تا اپریل	۱۹۳۹ء
اقبال کا نوجوان	نورالحسن ہاشمی	جامعہ	اپریل مئی ۱۹۳۹ء	
ہندوستانی زبان کا مسئلہ	سہیل عظیم آبادی	زمانہ	اپریل مئی ۱۹۳۹	
تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین		ادبی دُنیا، لاہور	جولائی ۱۹۳۹ء	ص ۶۹
			اگست ۱۹۳۹ء	ص ۶۹
دِینو (افسانہ)	دھرم پارکاش آنند	ادبِ لطیف	اپریل ۱۹۳۹ء	
بچپن (افسانہ)	کرشن چندر	ادبِ لطیف	جون ۱۹۳۹ء	
کیا قومی زبان بنائی جاسکتی ہے؟	ح۔ی۔ع	زمانہ	جون ۱۹۳۹ء	
اکبرالٰہ آبادی	عشرت حسین	زمانہ	جون ۱۹۳۹ء	
قصیدہ اور اُردو ادب	گرجانندن	دلگداز	جولائی ۱۹۳۹ء	
قلی قطب کی بارہ پیاریاں	ڈاکٹر زورؔ	سب رس	جولائی ۱۹۳۹ء	
جدید رسم الخط	آزاد انصاری	کلیم	مئی جون ۱۹۳۹ء	
تہنید	سلیمان ندوی	معارف	جون ۱۹۳۹ء	
اشتراکیت		نگار	جولائی ۱۹۳۹ء	

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین		ادبی دُنیا، لاہور	ستمبر ۱۹۳۹ء	ص ۷۰
سرقہ (مقالہ)	بسنت ہائے	داستان، لاہور	اگست ۱۹۳۹ء	
طوطا (ڈرامہ)	ہرندرناتھ چٹوپادھیہ	ساقی، دہلی	اگست ۱۹۳۹ء	
تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین		ادبی دُنیا، لاہور	نومبر ۱۹۳۹ء	ص ۶۲
ارنسٹ ٹولر (مقالہ)	سبطِ حسن	نیا ادب	اگست، ستمبر ۱۹۳۹ء	
تیسری جنس (افسانہ)	محمد علی ردولوی	کلیم	اگست ستمبر ۱۹۳۹ء	
ہمارے مزاح نگار (مقالہ)	محمود نظامی	نیرنگِ خیال	ستمبر ۱۹۳۹ء	
تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین		ادبی دُنیا	مارچ ۱۹۴۱ء	ص ۶۶
خوش مذاقی کے رُندھے (افسانہ)	محمد علی ردولوی	اضطراب، خاص نمبر	جنوری ۱۹۴۱ء	
تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین		ادبی دُنیا	اپریل ۱۹۴۱ء	ص ۵۸
نظیر اکبر آبادی (مقالہ)	شمس الدین احمد	معاصر	مارچ ۱۹۴۱ء	
تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین		ادبی دُنیا	مئی ۱۹۴۱ء	ص ۶۴
مسز ڈی کوسٹا (افسانہ)	سعادت حسن منٹو	ساقی	اپریل ۱۹۴۱ء	
تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین		ادبی دُنیا	اگست ۱۹۴۱ء	ص ۶۱
لو ایک قصہ سنو (افسانہ)	اختر انصاری	ادبِ لطیف	مئی جون ۱۹۴۱ء	

مختلف کتب کے دیباچے اور پیش لفظ

مولانا صلاح الدین احمد کے قلمی آثار کی چوتھی اہم جہت مختلف کتب کے دیباچے اور پیش لفظ ہیں۔ اِسی سلسلے میں یہ امر قابلِ ذِکر ہے کہ وہ اپنی تحریر میں اختصار کو ملحوظ رکھتے تھے اور بہت مختصر مگر جامع انداز میں کتاب کا دیباچہ رقم کرتے تھے۔

دیباچہ نویسی کے سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد مصنف، موضوعِ تصنیف اور اُس کی

اہمیت پر اپنی گفتگو کو چند ایک اقتباسات میں سمیٹ لیتے تھے۔اُن کے دیباچے دو یا تین صفحات سے تجاوز کم ہی کرتے تھے۔عموماً دو صفحوں میں کتاب پر اپنے اظہارِ خیال کو جامعیت کے ساتھ رقم کرتے۔

جن کتب کے دیباچے انھوں نے رقم کیے، اُن کے موضوعات متنوع ہیں۔جن میں شاعری، افسانہ، انتخاب نظم ونثر، تنقید اور معلوماتی کتب شامل ہیں۔اِن میں سے بیشتر کتب وہ ہیں جو اُن کے اپنے ادارے ''اکادمی پنجاب، لاہور'' کے زیرِ اہتمام اشاعت پذیر ہوئیں۔ذیل میں اُن کتب کی فہرست ملاحظہ ہو، جن کے دیباچے مولانا صاحب نے تحریر کیے:

ڈاکٹر وزیر آغا	خیال پارے	اکادمی پنجاب، لاہور		۱۹۶۱ء
وزیر آغا	اُردو ادب میں طنز و مزاح	//	//	۱۹۵۸ء
میرا جی	مشرق و مغرب کے نغمے	//	//	۱۹۵۸ء
وزیر آغا	مسرت کی تلاش	//	//	۱۹۵۸ء
مولانا حالؔی	حیاتِ جاوید	//	//	۱۹۵۴ء
داؤد رہبر	نسخہ ہائے وفا	//	//	
شمس آغا	اندھیرے کے جگنو	//	//	
کرشن چندر	نظارے	//	//	
عباس بیگ محشؔر	نگاہِ فطرت	//	//	
محمد علی ردولوی	گویا دبستان کھل گیا	//	//	
اثر صہبائی	بامِ رفعت	//	//	
وزیر آغا (مرتبہ)	۱۹۵۸ء کی بہترین نظمیں	//	//	
// //	۱۹۵۹ء کی بہترین نظمیں	//	//	
// //	۱۹۶۰ء کی بہترین نظمیں	//	//	
// //	۱۹۶۱ء کی بہترین نظمیں	//	//	

مصطفیٰ خان شیفتہ	دیوانِ شیفتہ	اکادمی پنجاب، لاہور
عصمت چغتائی	کلیاں	اکادمی پنجاب، لاہور
عاشق بٹالوی	تاریخ اور افسانہ	تاج کمپنی، لاہور
ڈاکٹر وزیر آغا	نظم جدید کی کروٹیں	اکادمی پنجاب، لاہور
ہاشمی فرید آبادی	غازیانِ تہذیب	// //
عبدالمجید سالک	انڈونیشیا اور اس کے لوگ	// //
ابرار صدیقی	بچوں کی ذہنی صلاحیتیں	// //
لطیف فاروقی	میٹھے گیت، میٹھی نظمیں	عبدالمجید پرنٹرز، لاہور
بیگم وحید الدین	آسٹریلیا اور اس کے لوگ	// //
سیّد ضمیر جعفری	ملایا اور اس کے لوگ	// //
ابنِ حسین	برما اور اس کے لوگ	// //
رانا ایم اے جاوید	جاپان اور اس کے لوگ	// //
مظفر احمد خان	سیلون اور اس کے لوگ	// //

مولانا صلاح الدین احمد کے دیباچوں میں یہ امر بطورِ خاص توجہ چاہتا ہے کہ کتاب کے موضوع کے ساتھ اُن کے اسلوب میں بھی ایک ایسا تغیر سامنے آتا ہے کہ کتاب کے موضوع کے ساتھ ایک خاص مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب ''خیال پارے'' کا دیباچہ اِن الفاظ میں رقم کرتے ہیں:

> ''رفیق گرامی ڈاکٹر وزیر آغا چند دِنوں سے ہمارے بعض بلند پایہ رسائل میں کچھ ایسے مضامین لکھ رہے تھے، جنھیں پڑھ کر ناظر کی کیفیت کچھ اُس بچے کی سی ہو جاتی ہے جو اسکول میں دیر سے پہنچا ہو اور جس نے ''گھر کا کام'' بھی نہ کیا ہو، لیکن اُس کے ہاتھوں پر بید پڑنے کے بجائے اُن میں

برفی اور قلاقند کے دو بڑے لفافے تھما دیئے جائیں۔"(۴۸)

اِسی طرح میراجی کے مجموعۂ مضامین وتراجم "مشرق ومغرب کے نغمے" کا دیباچہ رقم کرتے ہوئے تقسیمِ ہند اور اُس کے بعد کی پیداشدہ صورتِ حال کو اپنے خاص اسلوب میں اِس طرح لفظ کا رُوپ دیا:

> "تقسیمِ ملک کے ساتھ ہی بزمِ "ساقی" بھی منتشر ہوگئی اور جب از سرِ نو یہ کراچی میں جمی تو بادہ وجام کا انداز ہی بدل چکا تھا اور وہ سارے منصوبے ختم ہو چکے تھے، جن کی پرورش شاہ جہاں آباد کی ہوائے سازگار میں ہوئی تھی۔ اِن سطور کا راقم اور اِس کا ادارہ بھی حوادثِ روزگار سے غیر متاثر نہیں رہا لیکن جب ابلقِ ایام کے سموں کی گرد کچھ کچھ بیٹھی تو جی میں خیال آیا کہ اُس زمانے کی کچھ یادگاریں کیوں نہ سمیٹ لی جائیں، جیسے دوست اور دُشمن دونوں "ادبی دُنیا" کے دورِ زرّیں کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"(۴۹)

مولانا صلاح الدین احمد کے قلمی آثار کا تنوّع حیرت افزا ہے۔ انھوں نے زندگی بھر لکھا۔ مگر کسی موضوع پر کوئی ایسا مبسوط کام نہیں کیا جو ایک کتاب کی شکل اختیار کر پاتا۔ تاہم اُن کی وفات کے بعد بعض مقالات کے موضوع ارتباط کے باعث انھیں کتابی صورت ضرور دے دی گئی۔ اگرچہ اب بھی بعض تحریریں ایسی ہیں جنھیں مزید کتابوں کی شکل دی جاسکتی ہے۔ مثلاً اُردو زبان کے حوالے سے رقم کی گئی اُن کی تحریریں اِسی طرح مختلف کتب پر اُن کے جامع تبصرے بھی اِس لائق ہیں کہ انھیں کتابی شکل دی جائے۔

اُن کے مقالات، دیباچے، تبصرے اور تجزیے موضوعاتی سطح پر ایک تنوّع رکھتے ہیں۔ اُن کا رسالہ "ادبی دُنیا" محض ایک ادبی مجلّہ نہیں تھا بلکہ ایک ادارہ تھا۔ وہ اِس ادارے کے پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے مسلسل لکھتے۔ اُردو زبان کی ترویج وترقی نیز دفاع کے لیے لکھا۔ نئے ادیبوں کی Promotion کے لیے لکھا۔ ادبی مسائل پر گفتگو کی اقبالیات جیسے اہم

موضوع پر فکری وفنی حوالے سے مضامین رقم کیے۔ کانفرنسوں کے لیے مقالات تحریر کیے۔ ریڈیو کے لیے بھی لکھا۔ اگر چہ اُن کی ریڈیائی تقاریر قدرے ترمیم کے ساتھ مضامین یا تبصروں ہی کی صورت میں شائع ہوئیں۔

''ادبی دُنیا'' کے اداریوں میں اُردو زبان اور ادب کے نئے مسائل پر بات کی۔ ''کہنے کی باتیں'' اور ''شام کی باتیں'' کے عنوان سے تنقیدی شذرات تحریر کیے۔ مسافر ادبی رسائل کے باہمی ارتباط کی ایک صورت اُن کی تلخیصات ہیں جو اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد کے تراجم اُن کے قلمی آثار کی ایک اور جہت ہیں۔ یہ تراجم اگر چہ ادب سے وابستہ موضوع پر کتابوں کے نہیں ہیں لیکن سائنسی موضوع کی ترجمے کو جو انھوں نے سلاست کی شکل دی ہے۔ اُس سے اُن کے اندر ایک ادبی شان ضرور پیدا ہوئی ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد کی تنقیدی جہت میں نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی اور بعض قومی مقاصد کے فروغ کا عنصر غالب ہے۔ وہ نظریاتی ادیب ضرور تھے لیکن نظریہ ساز یا شدت پسند ناقد نہیں تھے۔ وہ اُردو کے خادم تھے اور اُردو کے اہلِ قلم کی پذیرائی اُن کا مطمحِ نظر تھا۔ اُن کا ادبی منشور اُردو زبان اور ادب کا فروغ تھا اور اُن کے منشور کے تناظر میں اُن کے قلمی آثار کا جائزہ لیں تو اُن کی وقعت، اہمیت اور اعتبار روشن، تاباں اور پائیدار ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ انور سدید: ''مولانا صلاح الدین احمد (کتابیات)'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱
۲۔ مولانا، صلاح الدین احمد: ''صریرِ خامہ (جلد اوّل، تصوراتِ اقبال) لاہور، ادارہ ادبی دُنیا، ۱۹۶۵ء
۳۔ مولانا، صلاح الدین احمد: ''صریرِ خامہ (جلد دوم، اُردو میں افسانوی ادب)'' لاہور، ادارہ ادب
۴۔ مولانا، صلاح الدین احمد: ''صریرِ خامہ (جلد سوم، محمد حسین آزاد)'' لاہور، المقبول پبلی کیشنز، س۔ن
۵۔ ''صریرِ خامہ (جلد دوم، تصوراتِ اقبال) ص ۳۷۳
۶۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ: دیباچہ ''صریرِ خامہ (جلد دوم) ص ۲
۷۔ ڈاکٹر انور سدید: ''مولانا صلاح الدین احمد — ایک مطالعہ'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۱ء، ص ۱۸۳
۸۔ ''صریرِ خامہ (جلد دوم) ص ۲۴۱۔۲۴۰
۹۔ ایضاً، ص ۲۲۵
۱۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا: ''تنقید اور احتساب'' لاہور، جدید ناشرین، ۱۹۶۸ء
۱۱۔ ''صریرِ خامہ'' (جلد سوم) ص ۵۷۔۴۳
۱۲۔ ایضاً، ص ۵۷
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۳۹
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۷۲
۱۵۔ سیّد وقار عظیم: دیباچہ ''صریرِ خامہ (جلد دوم)'' ص ۵
۱۶۔ صریرِ خامہ (جلد دوم) ص ۱۵۹
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۴۵۔۱۴۴
۱۸۔ ایضاً، ص ۱۷۹
۱۹۔ ایضاً، ص ۱۸
۲۰۔ ایضاً، ص ۱۰
۲۱۔ ایضاً، ص ۵
۲۲۔ ایضاً، ص ۳۱۰
۲۳۔ شان الحق حقی: ''مولانا صلاح الدین — شخصیت اور فن'' (مرتبہ: ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید)، کراچی، انجمن ترقیٔ اُردو، ۱۹۹۰ء، ص ۳۲۲

۲۴۔ ''صریرِ خامہ'' (جلد دوم) ص۸۲
۲۵۔ عاتکہ صدیقی: ''مولانا صلاح الدین احمد — شخصیت اور فن'' لاہور، کاغذی پیرہن، ۲۰۰۱ء
۲۶۔ ''صریرِ خامہ'' (جلد دوم) ص۲۹۶
۲۷۔ مولانا صلاح الدین احمد، مضمون ''غلطی ہائے مضامین'' ادبی دُنیا، فروری ۱۹۵۱ء ص۱۵
۲۸۔ مولانا صلاح الدین احمد، مضمون ''جدید شاعری پر ایک نظر'' ادبی دُنیا، اگست ۱۹۵۵ء ص۵۱
۲۹۔ مولانا صلاح الدین احمد، مضمون ''سرگزشت از سالک'' ادبی دُنیا، اگست ۱۹۵۵ء ص۵۹
۳۰۔ مولانا صلاح الدین احمد: مقدمہ ''حیاتِ جامعہ'' لاہور، اکادمی پنجاب، ۱۹۶۲ء، ص۳۰
۳۱۔ محمود احمد اسیر: ''مولانا صلاح الدین احمد — احوال و آثار'' ص۴۱۴
۳۲۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''سنت تکارام — ادبی دُنیا'' ۱۹۳۹ء، ص۹۱
۳۳۔ عاتکہ صدیقی: ''مولانا صلاح الدین احمد — شخصیت اور فن'' ص۲۴۳
۳۴۔ غلام رسول ازہر: ''مولانا صلاح الدین احمد کا اسلوبِ نگارش''، ''مولانا صلاح الدین احمد — شخصیت اور فن'' ص۲۹۸
۳۵۔ عاتکہ صدیقی: ''مولانا صلاح الدین احمد — شخصیت اور فن'' ص۲۴۵
۳۵۔ Bertha, Moriss Parker: "Clouds, Rain and Sroow" New York, Row Peterson and Company 1959, P:10.
۳۶۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''بادل، بارش اور برف'' لاہور، یونائیٹڈ پبلشرز، ۱۹۵۸ء، ص۳
۳۷۔ Bertha Morris Parker: "Birds New York, Roos Peterson And Company, 1950, P:3
۳۸۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''پرندے'' لاہور، یونائیٹڈ پبلشرز، س۔ن، ص۳
۳۹۔ Bertha Moriss Parker: "Birds" P:5.
۴۰۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''پرندے'' ص۵
۴۱۔ Bertha Morris Parker: "The earth's changing Srface" New York, Row Peterson and Company, P:9.
۴۲۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''زمین کی بدلتی ہوئی سطح'' لاہور، یونائیٹڈ پبلشرز، ۱۹۶۲ء، ص۹
۴۳۔ Bertha Morris Parker: "The earth's changing Surrface" P:3
۴۴۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''زمین کی بدلتی ہوئی سطح'' ص۳
۴۵۔ سیّد ضمیر جعفری: ''عندلیباں را چہ پیش آید ہزاراں را چہ شد'' ادبی دُنیا (یادگار نمبر) ص۴۹

۴۶۔ محموداحمد اسیر: ''مولانا صلاح الدین احمد — احوال وآثار'' لاہور، مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۰۹ء

۴۷۔ انور سدید: ''مولانا صلاح الدین احمد — ایک مطالعہ'' ص ۲۳۱

۴۸۔ مولانا صلاح الدین احمد: دیباچہ ''خیال پارے'' از ڈاکٹر وزیر آغا، سرگودھا، مکتبہ اُردو زبان، ۱۹۸۲ء (طبع دوم) ص ۷

۴۹۔ مولانا صلاح الدین احمد: دیباچہ ''مشرق ومغرب کے نغمے'' از میراجی، لاہور، اکادمی پنجاب، ۱۹۵۸ء

تیسرا باب

اُردو کے لیے خدمات

مولانا صلاح الدین احمد کی اُردو کے لیے خدمات کا اگر ایمان داری سے احاطہ کیا جائے تو شاید اُن کی پوری سوانح عمری کو دُہرانا ہوگا کہ اُن کی زندگی کے شعوری حصے کا کوئی ایسا پل نہیں ہے، جو خدمتِ اُردو سے خالی ہو۔ اُردو زبان کی تحسین، فروغ، دفاع اور نفاذ اُن کی زندگی کا مقصدِ اوّل اور مدّ عائے آخر تھا۔ اُردو اُن کی تہذیب تھی، اُن کا ماحول تھا، اُن کی ثقافتی فضا تھی، اُن کی وجہِ دوستی اور سببِ عداوت تھی، اُن کا نظریہ تھا، اُن کا نظامِ خیال تھا حتیٰ کہ اُن کا جزوِ ایمان تھا۔

بقول ڈاکٹر انور سدید:

> ''مولانا صلاح الدین احمد کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اعلائے کلمتہ الاردو تھا اور اِس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے مصلحت کوشی سے بے نیاز ہو کر اُردو زبان اور ادب کے لیے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ اپنا تن، من اور دھن نثار کیا اور اِس کی بقا اور ترقی کے لیے اپنی پوری زندگی اور بہترین صلاحیتیں وقف کر دیں۔''(۱)

اُردو کے مولانا صلاح الدین احمد کی مذکورہ خدمات کو زمانی لحاظ سے دو حصوں میں جب کہ عملی اقدامات کی روشنی میں کئی ایک جہات کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

زمانی لحاظ سے اُن کی خدمات کا پہلا عرصہ قیامِ پاکستان تک کا ہے جب کہ اُردو اور ہندی کا تنازعہ اُسی طرح عروج پر تھا جیسا کہ ہندوستان کی دو بڑی اقوام کے مابین مذہب کا جھگڑا۔ اگر چہ یہ لسانی مناقشہ قطعی طور پر مصنوعی تھا اور اُس زبان کے خلاف ایک محاذ تھا جو عوام میں

رائج اور مقبول تھی۔ اُس وقت کی ہندو قیادت کا یہ خیال تھا کہ:

''اُردو کا مستقبل مسلمانوں کے فرقے کا نجی معاملہ ہے اور اگر وہ اِسی زبان میں لکھنا پڑھنا چاہیں تو اُن پر کوئی پابندی مناسب نہ ہوگی۔ البتہ قومی سطح پر فوقیت ہندی یا ہندوستانی کو حاصل ہوگی۔''(۲)

یہی وہ نقطۂ نظر تھا جس کے باعث اُردو کے قومی سطح پر فروغ یا نفاذ کے خلاف سرگرمیاں شروع ہوئیں اور ہر سطح پر اُردو کے فروغ کا راستہ روکا گیا۔ ہندی نواز طبقہ اُردو دُشمنی میں کا ہر نوع کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اُردو کے خلاف جلسے بھی منعقدہ کیے جانے لگے اور قراردادیں بھی پاس ہونے لگیں۔ الغرض کوئی موقع ضائع نہ کیا گیا۔ جون ۱۹۴۵ء میں پنجاب ساہتیہ منڈل کا ایک جلسہ زیرِ صدارت بہاری لال چاننہ منعقد ہوا جس میں یہ قرارداد پاس کی گئی:

''چونکہ ریڈیو کی زبان عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت کے باعث حد درجہ ناقابلِ فہم ہے، اِسی لیے اِسی محکمے کے عملے میں فوری تبدیلیاں کی جائیں اور پچھتّر فی صد اسامیاں ایسے لوگوں سے پُر کی جائیں جو ہندی دان پبلک کے نمائندے ہوں اور جو زبان کے معاملے میں ہم سے انصاف کر سکیں۔''(۳)

اُردو کے خلاف اِس محاذ کے باعث یہ ضروری سمجھا گیا کہ اِس لسانی مناقشے میں بھرپور دفاعی پالیسی اپنائی جائے۔ چنانچہ اُردو کے تحفظ کے لیے تمام مسلمانانِ ہند اور اُن کی نمائندہ جماعتیں ایک ہوگئیں اور اُسی شد و مد کے ساتھ اُردو دفاع کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، جس قدر کہ جارحیت تھی۔ بقول فرمان فتح پوری:

''مسلم لیگ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، خلافت کمیٹی، جمعیت العلمائے پاکستان اور انجمن ترقی اُردو سمجھانے اُردو کو برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی رگ سمجھ کر اُس کو بچانے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ نے سیاسی سطح پر اُردو کا دفاع کیا اور اپنے مطالبات میں اُردو کی حفاظت کو بھی شروع ہی سے پیشِ نظر رکھا۔''(۴)

مولانا صلاح الدین احمد نے اِس صورتِ حال میں جو کردار ادا کیا وہ کسی جہاد سے کم نہیں۔ اُردو کو اپنے ایمان کا حصہ بناتے ہوئے اُردو کے فروغ اور اُس کے خلاف کارروائیوں کے سدِّ باب کے لیے تن، من اور دھن کی بازی لگا دی۔ اِسی سلسلے میں انھوں نے جو نمایاں اقدامات کیے۔ وہ یہ ہیں:

i۔ ''ادبی دُنیا'' کے اداریوں میں فروغ و دفاعِ اُردو کو مستقل اہمیت دی۔

ii۔ ''ادبی دُنیا'' میں اپنے تنقیدی شذرات میں اُردو کے دفاع کے لیے بطورِ خاص لکھا۔

iii۔ ''ادبی دُنیا'' میں اُردو کے حق میں اور ہندوستان کی لسانی صورتِ حال پر مضامین لکھوائے اور شائع کیے۔

iv۔ ''اُردو بولو'' تحریک شروع کی اور اِس کے لیے مختلف سلوگنز بنائے۔ (اِس کی تفصیل آگے آئے گی۔)

v۔ ''پنجاب اُردو کانفرنس'' کی بنا ڈالی۔

vi۔ اُردو یونیورسٹیوں کے قیام کی تجویز پیش کی اور اِن کی عملی شکل کے لیے جدوجہد کی۔

vii۔ ''مجلسِ تعمیرِ جامعہ اُردو'' تشکیل دی، جس کا ایک اہم شعبہ ''دارالتحقیق علم و ادب'' قرار پایا۔

viii۔ اُردو زبان کے دفاع کے لیے کانفرنسوں کا انعقاد کیا اور ہر اُس عملی جہد کا حصہ بنے جو اُردو کی بقا کے لیے ناگزیر تھی۔

ذیل میں ''ادبی دُنیا'' میں اُن کے اداریوں اور تنقیدی شذرات سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں جو انھوں نے اُردو کی دفاع اور فروغ کے تحریر کیے:

''آثار نہایت مبارک ہیں اور کام کرنے والوں کا جوش ٹھنڈا نہ ہو تو کچھ

عجب نہیں کہ ہمارے بچوں کی ایک بہت بڑی تعداد عادتاً اُردو بولنے لگے
اور آئندہ چند سالوں میں ہندوستان کے لسانی نقشے میں ایک حیرت انگیز
تبدیلی واقع ہو جائے۔''(۵)

''زبان کی حفاظت درحقیقت اپنے تمدّن اور اپنی تہذیب کے اُن
سرچشموں کی حفاظت ہے، جن سے ہم انفرادی زندگی میں مسرت حاصل
کرتے ہیں اور قومی زندگی میں حرکت اور طاقت اور جب مسرت، حرکت
اور طاقت آپ کے پاس ہوں تو دُنیا میں آپ کو ترقی اور فروغ سے کون
روک سکتا ہے۔''(۶)

مولانا صلاح الدین احمد کی اُردو بولو تحریک

ہندی کے مقابلے میں اُردو کے فروغ کے سلسلے میں مولانا صلاح الدین احمد کی ''اُردو بولو تحریک'' کا کردار بہت بھرپور ہے۔ یہ تحریک اگرچہ ابتداً اُن مختصر فرمودات بلکہ سلوگنز پر مبنی ہے جو ''ادبی دُنیا'' کے صفحات پر خالی جگہوں کو پُر کرنے کے لیے درج کیے جاتے تھے مگر اپنے اثر اور اُردو کے فروغ کے سلسلے میں خاصی کارگر ثابت ہوئی۔ بعدازاں اِس کے لیے صفحہ مختص کر دیا گیا اور ادبی دُنیا کا سرورق اُلٹتے ہی اِس تحریک کے سلوگنز پر نظر پڑتی جو جلی حروف میں درج ہوتے تھے۔ اِس تحریک کی اِبتدا کے بارے میں آغا بابر کا دعویٰ ہے کہ یہ اُن کی تجویز تھی۔ اِس سلسلے میں اُن کا کہنا ہے:

''دو برس ہوئے جب ''ادبی دُنیا'' کا دفتر مال روڈ کی ایک عمارت میں
تھا۔ میں نے ایک ملاقاتِ شام کے دوران میں ایڈیٹر ''ادبی دُنیا'' سے کہا
کہ آپ پرچے میں مضمون ختم ہونے پر میر، غالب یا حالی کا کوئی شعر
چھاپ دیتے ہیں۔ یہ خانہ پری اچھی چیز ہے مگر میری ایک تجویز ہے۔۔۔
یہ کہ کہیں لکھ دیا جائے ''اُردو بولو'' کہیں یہ کہ ''بچوں سے اُردو بولو۔''(۸)

یہ مختصر سے سلوگن اپنے حلقۂ اثر کے اعتبار سے بہت وسعت کے حامل ثابت ہوئے

اور یہ تحریک وقت کے ساتھ ساتھ اذہان میں ایک مثبت شعور اور تبدیلی کا باعث بنی۔ اِن اعلانات میں نہایت سادہ مگر پراثر انداز کے الفاظ شامل کیے جاتے، جن میں لسانی سطح کی ایک فکری دعوت ہوتی۔ یہ اعلانات اُردو کے حق میں ہوتے لیکن کوئی ایسا اعلان شائع نہ ہوا، جو ہندی کے خلاف ہو، جس کا مقصد یہ تھا کہ بغیر محاذ آرائی کی فضا پیدا کیے اُردو کے لیے راہ ہموار کی جائے، چنانچہ صرف اُردو کے فروغ اور اہمیت پر اعلانات درج کیے گئے۔

ادبی دُنیا کے صفحات پر اِن اعلانات کی نوعیت کیا تھی۔ مناسبت ہوگا کہ چند منتخب اعلانات درج کیے جائیں:

''اُردو بولو''(۹)

''اُردو بولو تحریک کی مدد کیجیے۔''(۱۰)

''اُردو بولو۔ اُردو بولنے سے آپس میں محبت بڑھتی ہے۔''(۱۱)

''اُردو بولو۔ اگر آپ کی زبان ایک ہے تو کبھی نہ کبھی آپ کے دِل بھی ایک ہو جائیں گے۔''(۱۲)

''اُردو ایشیا کی سب سے بڑی زبان ہے۔''(۱۳)

''اُردو بولو اور ایشیا کی سب سے بڑی قوم بن جاؤ۔''(۱۴)

''قاہرہ سے لے کر شنگھائی تک اُردو یکساں طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اُردو بولو۔''(۱۵)

''اُردو اور انگریزی، انگریز اور امریکن، کو انگریزی زبان لاتی ہے۔ ہندو اور مسلمان کو اُردو زبان ملائے گی۔''

''اُردو بولو۔''(۱۶)

''اُردو کے تین گن

اُردو ہندوستان کی علمی زبان ہے

اُردو ہندوستان کی سماجی زبان ہے

اُردو ہندوستان کی عوامی زبان ہے
اُردو بولو۔اور اُردو بولو تحریک میں شامل ہو جاؤ۔''(۱۷)
''اُردو بولو۔اُردو بولنے سے ہماری قومی عزت بڑھتی ہے
اُردو کو انگریزی کی جگہ دے کر اپنا قومی وقار بڑھائیے۔اُردو بولو۔''(۱۸)
''پنجابی، پشتو، سندھی سب ہمیں پیاری ہیں مگر اُردو،
اُردو ہماری جان اور ایمان ہے۔
اُردو بولو۔اور ایک ہو جاؤ۔اُردو۔اُردو۔اُردو۔''(۱۹)
''ہم زبانی ہم دِلی کی پہلی شرط ہے۔اُردو بولو۔
اُردو بولو اور یک جان ہو جاؤ۔''(۲۰)
''اُردو وہ جادو ہے جو سَر چڑھ کر بولتا ہے
اُردو بولو۔''(۲۱)

یہ مختصر، بے ضرر مگر پُر اثر اعلانات بڑی سرعت کے ساتھ ذہنی بیداری کا باعث بنے۔ اِس تحریک کے اثرات کس قدر وسیع تھے۔اِس سلسلے میں مولوی عبدالحق کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

''آپ کی تحریک ''اُردو بولو'' نہایت قابلِ قدر اور لائقِ عمل ہے۔یوں تو پنجاب میں اور خاص کر لاہور میں بہت سی انجمنیں اور بزمیں ہیں اور کام بھی کرتی ہیں لیکن اِن سب کے کام مِلا کر بھی اِس تحریک کو نہیں پہنچتے۔یہ بنیادی کام ہے۔اِس وقت تو شاید لوگ اِسے زیادہ اہمیت نہ دیں لیکن ایک ایسا وقت آئے گا، جب اِس کے حیرت انگیز نتائج کا قائل ہونا پڑے گا۔ اِس کی کامیابی پر ہمارے بہت سے مسائل کی کامیاب کا انحصار ہے۔''(۲۱)

تقسیمِ ہند کا واقعہ کئی ایک جہتوں سے غیر معمولی ہے۔ہندوستان کا دو ملکوں میں بٹوارا ہوا۔وحدت کی شکست کا یہ واقعہ کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا لیکن عجیب اسالیب ہوئے کہ ہندوستان

فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔قتل و غارت اور آتش زنی اِسی طرح عام ہوئی گویا یہ کوئی زندگی کے روزمرہ معمولات میں سے ہے۔

اِن واقعات میں خود مولانا کا مکان نذرِ آتش ہو گیا۔ اُن کا قیمتی کتب خانہ اور اُن کی معیشت کے اسباب جل گئے مگر خواب تا حال زندہ رہے۔ گوپال متل کا بیان دیکھیے :

''لاہور جلنے لگا اور مسلمانوں کے لٹے ہوئے قافلے وہاں پہنچنے لگے لیکن مولانا صلاح الدین احمد کی گفتگو کا محور ایک ہی رہا۔ پنجاب میں اُردو کا کیا بنے گا؟ اُن کا مکان جل کر راکھ ہو گیا تھا اور اُن کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں اُبھری تھی جب بھی مولانا کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مصائب سے بے پروا صرف اُردو کے مستقبل کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا کرتے تو وہ صرف دوسروں کے مصائب ہی سے نہیں، اپنے مصائب سے بھی بے نیاز ہوتے تھے۔ انھوں نے اُردو کے غم کو اِتنا اپنا لیا تھا کہ باقی تمام غموں سے بے نیاز ہو گئے تھے۔''(۲۲)

قیامِ پاکستان کے بعد مولانا صلاح الدین احمد کی خدماتِ اُردو کا زاویہ تبدیل ہو گیا اور انھوں نے حالات کے نئے تناظر کی روشنی میں ایک الگ لائحۂ عمل اختیار کیا۔

اُردو کے بارے میں مولانا کوئی محدود نقطۂ نظر نہیں رکھتے تھے، اُن کے نزدیک یہ زبان پوری ملتِ اسلامیہ کی زبان ہے اور افرادِ ملت کے مابین وحدت کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اُردو زبان کا فروغ ہندوستان میں بڑے فطری انداز میں ہوا اور صدیوں کے اشتراکِ تمدن نے اِس زبان کے ارتقا میں ایک خاص کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو زبان کو تہذیبی اشتراک کی علامت، امین اور سرمایہ دار خیال کرتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے بعد یہ ایک حقیقت تھی کہ یہ زبان پاکستان کے باشندوں کی زبان

بن کر رہ گئی۔ ایسا نہیں کہ اب ہندوستان میں اِس کی تہذیبی شناخت ختم ہوگئی بلکہ سیاست نے کچھ ایسا زاویہ اختیار کیا کہ وہاں کی حکومت نے اپنی پالیسیوں کی روشنی میں ہندی کو باقاعدہ طور پر نافذ کر دیا اور ذرائع ابلاغ و تعلیم میں ہندی کی برتری قائم کر دی۔ یہی وہ دُکھ تھا جس سے مولانا صلاح الدین احمد مغلوب ہوگئے لیکن اب یہ قضا کا فیصلہ تھا جسے قبول کیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اُن کے خیال میں تقسیمِ ملک کے بعد اُردو کی عالمگیر حیثیت ختم ہوچکی ہے اور وہ زبان جو نہ صرف برِعظیم ہند، ایشیا، یورپ اور افریقہ کی ہر بندرگاہ میں بولی اور سمجھی جاتی تھی، اب ایک چھوٹے سے ملک بلکہ اُس کے ایک حصے کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔ اِسی لیے انھوں نے یہ اعتراف کیا کہ یہ زبان جس عجیب دوراہے پر کھڑی ہے، اِس میں سے ایک پھوٹنے رستہ چند ہی قدم پر ایک مہیب چٹان کے کنارے پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور دوسرا ایک خم کھا کر ایک دُور سے نظر آنے والے جنگل کی طرف چلا جاتا ہے اور جنگل پر ایک غیر یقینی مستقبل کا دُھندلکا چھا رہا ہے۔

مولانا کے مذکورہ خیالات جزوی صداقت رکھتے ہیں، خصوصاً ان کا یہ نقطۂ نظر کہ اُردو زبان کی عالمگیر حیثیت ختم ہوچکی ہے اور اب وہ ایک چھوٹے سے ملک کے ایک مخصوص خطے کی زبان ہے۔ معاصر حالات میں دیکھا جائے تو اِس زبان نے اپنے فروغ کے حوالے سے کم از کم ملکِ پاکستان میں مکانی حدود کو اہمیت نہیں دی اور یہ زبان ہر خطے میں برابر فروغ پا رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پنجاب میں اپنی تہذیبی تاریخ کے باعث زیادہ کام ہوا ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد اُردو کے جس دوسرے راستے کی طرف مولانا صاحب نے جو اِشارہ کیا ہے کہ وہ جنگل میں کھو جاتا ہے دراصل دشتِ فرنگ ہے۔ یہ انگریزی زبان کا وہ دُھندلکا ہے، جس میں کھو کر اُردو کو راستہ نہیں مِل رہا اور مولانا صلاح الدین احمد کی معاصر کوششوں کا محور یہی تھا کہ اُردو کو کس طرح انگریزی کے مقابلے میں اُس کا جائز اور صحیح مقام دلایا جائے۔

اُن کی موجودہ کوششوں کو دیکھا جائے تو اُن میں علمی سطح پر ایک وسعت نظر آتی ہے۔ اُن کی فکری اساس کے لحاظ سے اُن کا مقالہ ''تقسیمِ ملک کا اثر اُردو زبان و ادب پر'' بہت اہم ہے جو

انھوں نے حلقہ اربابِ ذوق کے سالانہ جلسے مارچ ۱۹۴۸ء میں پیش کیا اور بعدازاں پنجاب یونیورسٹی کی اُردو کانفرنس منعقدہ اپریل ۱۹۴۸ء میں پڑھا۔ اِس مقالے میں انھوں نے نہایت دردمندی اور دُکھ کے ساتھ لکھا:

''ایک غلط قسم کی وطنیت اور فرقہ پرستی نے ہندوستان کے صاحبِ اقتدار طبقے میں یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے یا کم از کم ہندو مسلم اشتراکیت و اتحاد کی یادگار نہیں بلکہ مسلم اقتدار کی یادگار ہے اور اِس لیے اِسے مٹا دینا چاہیے۔ چاہے اِس کے مٹا دینے سے خود اپنی تہذیب اور اپنے کلچر کا ایک نہایت خوبصورت حصہ بھی نہ مٹ جائے ـــــ ایک بے خیال ذریعۂ اظہار سے ہاتھ دھولیں اور مصنوعی اور بے جان کو اپنی قومی زبان سمجھ کر اختیار کر لیں۔''(۲۳)

مولانا صلاح الدین احمد کے مذکورہ بیان میں کیفیتِ کرب واضح ہے لیکن اُنھوں نے اِس بات کو روگ بنانے کے بجائے اُردو کی موجودہ حیثیت میں اِس کے فروغ، ارتقا اور نفاذ کے لیے اپنی کوششوں کو مربوط کیا اور آئندہ لائحۂ عمل پر غور کیا۔ اِس سلسلے میں انھوں نے اپنی تحریروں میں اُردو کی قومی زبان کی حیثیت کے موضوع کو ایک مرکزی نکتے کے طور پر اختیار کیا اور ہمہ وقت اِس پر لکھتے رہے۔ انھوں نے پاکستان میں اُردو کو حقیقی معنوں میں قومی زبان بنانے کے لیے عمدہ تجاویز دیں۔ اِس حوالے سے اُن کا خیال تھا:

i۔ زبان کو سخت جکڑبندیوں سے نجات دلائیں اور اِسے اپنے نئے ماحول میں پنپنے کا موقع دیں۔

ii۔ اُردو کے وسیع تر مفاد کے پیشِ نظر اِس کے دروازے صوبائی بولیوں کے مخصوص الفاظ اور محاوروں کے لیے کھول دیے جائیں۔

iii۔ اُردو میں انتقالِ علوم کا کام بڑے پیمانے پر جاری کیا جائے اور اکنافِ عالم

کے علمی ذخیرے سے اُردو کی علمی اور ادبی تعمیر کی بنیادی توسیع کا کام لیا جائے۔

iv۔ ادبی مشاغل کے نام پر پانے والی تفریح کا سدِباب کیا جائے۔

مذکورہ بالا تجاویز کی روشنی میں انھوں نے متعدد مقالات لکھے جو شائع بھی ہوئے اور انھوں نے مختلف کانفرنسوں اور سیمی ناروں میں پیش کیے۔ اِس کے علاوہ انھوں نے یہ ضرورت محسوس کی ''اُردو بولو تحریک'' کو ایک نئی توانائی کی ضرورت ہے اور اِس کے لیے نئے حالات کے تناظر میں ایک تازہ لائحۂ عمل تیار کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے سلوگنز کے ساتھ ساتھ اپنے اداریوں اور تنقیدی شذرات میں مزید شد و مد کے ساتھ لکھا اور قومی زبان کے لیے باقاعدہ ایک مجاہد کا کردار ادا کیا۔ اِس سلسلے میں انھوں نے پاکستان کے تمام باشندوں، وہ چاہے کسی بھی شعبۂ زندگی سے وابستہ ہوں سے خطاب کیا اور انھیں انگریزی سے گریز کے لیے تاکید کی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اگر ہم اپنے مخاطبین سے اُردو کے سوا کسی اور زبان میں بات کرنے سے اِنکار کر دیں۔ اگر ہم ڈاکخانے، ریلوے، میونسپلٹی، یونیورسٹی، بنک، انکم ٹیکس وغیرہ کے محکموں سے صرف اُردو میں خط و کتابت کریں اور اُن کے انگریزی خطوط واپس کر دیا کریں تو مجھے اُمید ہے کہ اِن اداروں میں اُردو کے رواج کی تحریک چل نکلے گی۔''(۲۴)

اُردو کے فروغ اور نفاذ کے لیے ''اُردو بولو تحریک'' کے علاوہ انھوں نے اپنے وسائل سے ''اکادمی پنجاب'' کی بنیاد رکھی۔ اِس سلسلے میں اُن کو سیّد وحیدالدین، اے ڈی اظہر اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تعاون حاصل تھا۔ اِس اکادمی کے مقاصد اُردو زبان و ادب کی نشو و نما کے لیے متنوع جہتوں میں کام کرنا تھا۔

''اکادمی پنجاب'' کے مقاصد کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے درج ذیل پانچ نکات پیش کیے ہیں:(۲۵)

i۔ قومی زبان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنا۔

ii۔ اُردو کی ترقی اور فروغ کے علمی کامرانیوں میں اضافہ۔

iii۔ ملک وقوم کی تہذیب وارتقا کے لیے اعلیٰ درجے کے مصنّفین کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا۔

iv۔ مغربی پاکستان میں سنجیدہ ادب کی نشر واشاعت۔

v۔ ملک کے بہترین دِل ودماغ کو تسکین وآسائش فراہم کرنا۔

مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو زبان کے قومی مرتبے کی راہ میں دو بڑی رکاوٹوں کے خلاف کھل کر لکھا اور انھیں دُور کرنے کے لیے سنجیدہ تجاویز پیش کیں۔ اِن رکاوٹوں میں پہلی رکاوٹ برسرِ اقتدار اور انگریزی نواز طبقہ تھا جو مختلف حیلوں بہانوں سے اُردو کو سرکاری زبان سے اجتناب کی راہ اختیار کر رہا تھا۔ وہ ایوانوں میں اُردو کے حق میں آواز بھی اُٹھاتا تھا تو اِس طور سے کہ اُس کے مفادات کو زک نہ پہنچے۔

دسمبر ۱۹۵۶ء مین انجمن ''آزاد خیال مصنّفین'' کے پہلے سالانہ جلسے میں انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا:

''حضرات! یہ ایک لمحۂ فکر یہ ہے عہدِ حاضر کے اُن خواص کے لیے جو آج اپنی زبان کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے اور اپنے گذشتہ فرنگی حاکموں کی زبان کو اپنے سینے سے لگائے اور اپنی زبانوں پر چڑھائے پھرتے ہیں اور اگرچہ اِن میں کوئی خسرو، کوئی فیضی، کوئی بیدل اور کوئی گرامی نہیں ہے اور اگرچہ یہ اَمر بے حد مشکل ہے اور قریب قریب محال ہے کہ وہ انگریزی میں صاحبِ تصنیف ہوسکیں یا کم از کم اہلِ زبان کی سی زبان بول یا لکھ سکیں۔ تاہم وہ اپنی اور بچوں کی بہترین توجہ انگریزی کے حصول پر صرف کرتے اور کرواتے اور اِسی نسبت سے خود اپنی زبان کی طرف سے تغافل و تساہل

میں ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔"(۲۶)

۲۷ /اپریل ۱۹۶۲ء کو انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے میں مولانا صلاح الدین احمد نے صدرِ پاکستان سے بعض تقاضے کیے جو تاریخی بھی تھے اور دیرپا اثرات کے حامل بھی۔ انھوں نے یہ واضح مطالبہ کیا کہ بنگالی زبان کا رسم الخط عربی کیا جائے تاکہ بنگال کلکتے کے بجائے ڈھاکہ کی طرف دیکھے۔ تعلیمی اداروں سے انگریزی کا طنطنہ ختم کیا جائے تاکہ ہماری نئی نسل اپنے تہذیبی ورثے کے سوادِ اعظم سے قریب تر ہو۔ مولانا صاحب کا آخری تقاضا بہت بھرپور تھا کہ ایک وزارتِ قومی زبان قائم کی جائے جو دس سال کے اندر اندر اُردو کو سرکاری و دفتری زبان کے طور پر نافذ کرے اور انگریزی کے دیس نکالے میں اپنا کردار ادا کرے۔

مذکورہ تقاضوں کے علاوہ مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی پیش کی۔ یہ تجویز دراصل بابائے اُردو مولوی عبدالحق کا وہ تمنا تھی، جس کے لیے وہ اپنے آخری ایامِ زندگی میں نہایت بے تاب اور بے چین رہ چکے تھے۔

اُردو زبان کے فروغ میں محض برسرِ اقتدار طبقہ ہی رکاوٹ نہ تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد اُن تعصّبات کے شعلے بھی دیکھ رہے تھے، جو وطنِ عزیز میں لسانی بنیادوں پر بھڑکائے جا رہے تھے۔ اِس سلسلے میں بطورِ خاص مشرقی پاکستان میں جو صورتِ حال تشکیل پا رہی تھی، اُسی کے اثرات پورے ملک میں منفی طور پر سامنے آنے لگے اور جن سے قومی وحدت کا شیرازہ بکھرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ایسے میں مولانا صلاح الدین احمد نے نہایت دردمندانہ انداز میں لکھتے ہوئے اہلِ قوم کو متنبہ کیا:

> ''آج خلیجِ بنگال سے جو آندھی اُٹھی ہے، اُس کی جھونکے مغربی پاکستان کے میدانوں میں پہنچ کر ان چنگاریوں کو اور بھی اُجلا کر رہے ہیں، جو وحدتِ قومی کی راکھ میں کجلا کر رہ گئی تھیں اور کوئی دِن کی بات ہے کہ یہ اخگر بھی شعلوں کی صورت اختیار کر لیں گے۔"(۲۷)

مولانا صلاح الدین احمد کا مزاج رجائی تھا۔ وہ یاسیت پسند نہ تھے لیکن اُردو کو نظر انداز کیے جانے کا رویہ اُن کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں اُردو کی حوالے سے لکھی گئی اُن کی تحریروں میں طنز اور زہر خند کا رویہ نمایاں ہے۔ آخری دور کی تحریریں دیکھی جائیں تو انھیں اپنی موت اور اُردو کے حوالے سے اپنی خواہشات کے ادھورے پن کا احساس بڑا واضح نظر آتا ہے۔ انھیں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ''جادۂ حیات کا یہ مسافر اپنے سفر کے آخری مراحل''[۲۸] طے کر رہا ہے اور ''رخشِ زندگانی اب پر لگا کر اُڑا جا رہا ہے۔''[۲۹]

''ادبی دُنیا'' کا آخری اداریہ ملاحظہ کیا جائے تو یہ تحریر ایک نوحہ دِکھائی دیتی ہے۔ اِس تحریر میں یہ اَمر حیران کن ہے کہ انھیں اپنی موت کا احساس بڑی شدت سے ہوا لیکن اِس سے بڑھ کر یہ اَمر حیرت بڑھاتا ہے کہ انھیں اپنی موت کی صورت میں اپنے بچوں کی یتیمی کا اتنا احساس نہیں تھا جتنا انھیں اُردو کے یتیم ہونے کا دُکھ ہو رہا تھا۔ یہ اداریہ ملاحظہ ہو:

> ''اگر ایک پیارا سا یتیم بچہ آپ کے سپرد کیا جائے اور آپ سے یہ توقع کی جائے کہ آپ اسے اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھیں گے اور اِس کی صحت مندانہ پرورش میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے تو یقیناً یہ کوئی غیر فطری یا قابلِ اعتراض بات نہیں ہو گی۔ حوادثِ زمانہ کی یہ دولت ہماری قومی زبان اُردو کی حیثیت بھی ایک یتیم بچے کی سی ہو چکی ہے۔ آج سے سترہ برس پہلے ہم نے ایک عظیم الشان جائیداد اس نونہال کی پرورش کے بہانے سے حاصل کی تھی اور جب تک یہ حاصل نہیں ہوئی تھی ہم شب و روز یہ واویلا کرتے تھے کہ جب تک ہمیں یہ جائیداد نہیں ملے گی۔ ملت کے اس لال کی صحیح پرورش کبھی نہیں ہو سکے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نالہ وفریاد کا جواب اس عظیم الشان عطیے کی صورت میں دیا جسے عرفِ عام میں مملکتِ خداداد پاکستان کہتے ہیں۔ ہماری ساری آرزوئیں پوری ہوئیں۔ آزادی

نصیب ہوئی، دولت بڑھی، عزت بڑھی، اِمکانات بے پایاں ہو گئے لیکن افسوس ہے کہ اسی نسبت سے ہماری بے نیازی بے توجہی اور حمیتی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور آج کیفیت یہ ہے کہ وہ زبان جو ہماری قومیّت اور ثقافت کی نمایندہ تھی اور جو مطالبہ پاکستان کے عناصر جواز میں ایک عنصر عظیم کی حیثیت رکھتی تھی اور جسے معمارِ پاکستان نے اس مملکت کی واحد قومی زبان قرار دیا تھا۔ آج ایک نامطلوب اور غیر پسندیدہ اجنبی کی طرح ہماری آنکھوں میں کھٹکتی ہے اور ہم طرح طرح کے بہانے بنا کر اس ''روزِ بد'' کو دُور سے دُور کرتے چلے جا رہے ہیں جس روز یہ اپنے صحیح منصب پر فائز ہونے کی اُمیدوار اور حق دار ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا تازہ ترین کارنامہ یہ ہے کہ برسوں سے ہم نے اس یتیم بچے کو زمین پر لٹا رکھا ہے اور خدام کو تاکید کر دی گئی ہے کہ خبردار اسے اُٹھنے، بیٹھنے اور چلنے پھرنے نہ دینا۔ مبادا اس کے دست و پا میں اِتنی طاقت آ جائے۔۔۔ کہ ہمیں اس کا وہ قرض چکانا پڑ جائے جو مدتوں سے ہم پر واجب الادا ہے۔ بارہ برس کی اس عجیب و غریب میعاد میں سے جو ہم نے اس یتیم بچے کے جائزہ اہلیت کے لیے مقرر کر رکھی ہے۔ چار برس گزرنے کو آئے ہیں۔ اس عرصے میں جو کچھ ہم نے اس غریب کے لیے کیا ہے اس کو پیشِ نظر رکھا جائے تو آیندہ آٹھ برس کی فتوحات کی نسبت کسی قسم کی خوش آیند توقعات رکھنا قطعاً بے معنی ہو گا۔ اگر ہم دِل سے چاہتے ہیں کہ بارہ برس کے اس وقفے میں ہماری قومی زبان علوم و فنون سے اس قدر مالا مال ہو جائے کہ اس کے لیے قومی زندگی کے بیش تر شعبوں میں انگریزی کی جانشینی قطعاً مشکل نہ رہے تو ہم اسے زمین پر لٹائے رکھنے اور آہستہ خرامی کا مشورہ دینے کی بجائے

اسے اس قدر تیزی سے دوڑاتے کہ مہینوں کی منزلیں دِنوں میں طے ہو
جاتیں مگر ایسا اسی صورت میں ہوتا جب ہمارے مقاصد بھی وہی ہوتے جو
زندہ قوموں کے مقاصد ہوتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ قومی اہمیت کے ایسے
مسائل میں جیسا کہ قومی زبان کا مسئلہ ہے جب تک ساری قوم سعی وعمل
کے ایک بخار میں مبتلا نہ ہو جائے، بات نہیں بنا کرتی یہ اور بات ہے کہ
بات بنانا مقصود بھی ہے یا نہیں۔ انگریزی روز بہ روز ہماری انفرادی اور
اجتماعی دونوں زندگیوں پر چھائے چلی جارہی ہے اور آیندہ آٹھ برس میں
آج کی نسبت بہت زیادہ چھا چکی ہوگی اور آج اعلیٰ طبقے کے جو بچے
انگریزی اسکولوں میں تعلیم پارہے ہیں وہ اسی تعلیم وتربیت سے آراستہ ہو
کر حکومت کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ چکے ہوں گے۔ اس وقت ان سے یہ
توقع رکھنا کہ وہ انگریزی کی جگہ اُردو کو دِلانے کی کوشش کریں گے، ایک
دیوانے کا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر کبھی برآمد نہیں ہوگی۔''(۳۰)

مولانا صلاح الدین احمد کے یہ الفاظ گویا مستقبل کے منظر نامے کی تصویر ہیں۔ اُن کی تمام تر زندگی اُردو کے تحفظ، فروغ، دفاع اور نفاذ کی کوششوں میں گزری۔ یہ کوششیں ایک ایسی زبان کے لیے تھیں جو ایک عظیم تہذیب کی ترجمان اور امانت دار تھی مگر جس ہوائے مخالف کو ورثے میں پایا اور تا حال اِس تندیٔ بادِ مخالف کا سامنا کر رہی ہے۔ غنیمت نہیں وہ لوگ جنھوں نے شعبۂ اُردو کے لیے ایک مضبوط بادبان کا کام کیا ورنہ تو اِس کے دُشمنوں ہی نے نہیں بعض نادان دوستوں نے بھی اِس کے ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

مولانا صلاح الدین احمد نے اُردو کے دفاع کے لیے ہر ممکن قدم بھی اُٹھایا اور آواز بھی۔ ''ادبی دُنیا'' کے اداریے، تنقیدی شذرات، اُردو بولو تحریک، اکادمی پنجاب ہر وقت آزمائی جو اُردو کے تحفظ کے لیے کارگر ہو سکتی تھی۔ یہ کہنا قطعی طور پر بجا ہوگا کہ مولوی عبدالحق کے بعد مولانا

صلاح الدین احمد نے اُردو کے لیے جو مجاہدہ اور ایثار کیا اُردو کی تاریخ میں اُس کی دوسری مثال آج تک سامنے نہیں آئی۔"(۳۱)

یہ سوال اپنی جگہ کہ دوسری مثال کیوں سامنے نہیں آئی؟ اُردو زبان وادب کے لیے فی زمانہ اِتنے ادارے موجود ہیں اور متعدد جامعات میں اُردو کے شعبے بھی کام کررہے ہیں لیکن تاحال اُردو کا وہی حال ہے جو مولانا صلاح الدین احمد کے آخری اداریے کی سطور میں دِکھایا گیا ہے۔ کیا اُردو کا نفاذ واقعی ایک دیوانے کا خواب ہے؟ جس کی تعبیر کی تلاش ایک بےسود عمل ہے؟ اِس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، ممکن ہے مستقبل میں اِس کا جواب مثبت نتائج کی صورت میں مِل جائے، فی الحال تو

ع اِک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ڈاکٹر انور سدید: ''مولانا صلاح الدین احمد ___ ایک مطالعہ'' اسلام آباد، اکادمی ادبیاتِ پاکستان، ص ۶۵
۲۔ یہ اقتباس مولانا صلاح الدین کے نام گاندھی کے خط سے ہے، جس کا حوالہ مولانا صاحب کے صاحبزادے وجیہہ الدین نے دیا ہے۔ ملاحظہ ہو اُن کا مضمون ''اب جی کی باتیں''، ''مولانا صلاح الدین احمد ___ شخصیت اور فن'' انجمن ترقی اُردو، پاکستان، ص ۳۲
۳۔ ڈاکٹر انور سدید: ''مولانا صلاح الدین احمد ___ ایک مطالعہ'' ص ۷۹
۴۔ ایضاً، ص ۷۷
۵۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''ادبی دُنیا'' جولائی ۱۹۴۳ء، ص ۷
۶۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''ادبی دُنیا'' مارچ ۱۹۳۴ء، ص ۷
۷۔ ایضاً، ص ۷۱
۸۔ آغا بابر: ''اُردو بولو تحریک''، ''ادبی دُنیا'' فروری ۱۹۴۸ء، ص ۲۶
۹۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''ادبی دُنیا'' مارچ ۱۹۴۴ء، ص ۷۱
۱۰۔ ایضاً، اکتوبر ۱۹۴۵ء، ص ۱
۱۱۔ ایضاً، دسمبر ۱۹۴۵ء، ص ۱
۱۲۔ ایضاً، مارچ ۱۹۴۷ء، ص ۹
۱۳۔ ایضاً، مئی ۱۹۴۶ء، ص ۳
۱۴۔ ایضاً، اپریل ۱۹۴۶ء، ص ۳
۱۵۔ ایضاً، جون ۱۹۴۶ء، ص ۳
۱۶۔ ایضاً، جولائی ۱۹۴۶ء، ص ۳
۱۷۔ ایضاً، اگست ۱۹۴۶ء، ص ۱
۱۸۔ ایضاً، ستمبر ۱۹۴۶ء، ص ۱
۱۹۔ ایضاً، اکتوبر ۱۹۴۶ء، ص ۱
۲۰۔ ایضاً، نومبر ۱۹۴۶ء، ص ۱
۲۱۔ مولوی عبدالحق کا یہ بیان آغا بابر کے مضمون ''اُردو بولو تحریک'' سے اخذ کیا گیا ہے۔
۲۲۔ گوپال متل: ''لاہور کا جو ذِکر کیا'' دِلّی، مکتبہ تحریر، ۱۹۴۹ء، ص ۸۵

۲۳۔ مولانا صلاح الدین احمد، ''ادبی دُنیا'' دسمبر ۱۹۴۸ء، ص ۲۵

۲۴۔ مولانا صلاح الدین احمد، ''ادبی دُنیا'' مارچ، ۱۹۴۹ء، ص ۲۴

۲۵۔ ڈاکٹر انور سدید: ''مولانا صلاح الدین احمد ــــ شخصیت اور فن'' ص ۹۸

۲۶۔ صلاح الدین احمد: خطبۂ صدارت انجمن آزاد خیال مصنّفین، ص ۴

۲۷۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''ادبی دُنیا'' فروری ۱۹۵۷ء، ص ۵

۲۸۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''ادبی دُنیا'' دور پنجم، شمارہ ۱۱، ص ۲۵۵

۲۹۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''صریر خامہ'' (جلد سوم)، لاہور، المقبول پبلی کیشنز، س۔ن، ص ۱۵۳

۳۰۔ مولانا صلاح الدین احمد: ''ادبی دُنیا'' مارچ ۱۹۶۴ء، ص ۱۰۔۹

۳۱۔ محمود احمد اسیر: ''مولانا صلاح الدین احمد ــــ احوال و آثار'' لاہور، مجلس ترقیٔ ادب، ۲۰۰۹ء، ص ۴۰۳

کتابیات

بنیادی مآخذ

تنقیدی کتب

۱۔ صلاح الدین احمد،مولانا: ''صریرِ خامہ (جلد اوّل،تصوراتِ اقبال) لاہور، ادارہ ادبی دُنیا،۱۹۶۵ء

۲۔ صلاح الدین احمد،مولانا: ''صریرِ خامہ (جلد دوم،اُردو میں افسانوی ادب)''لاہور، ادارہ ادب

۳۔ صلاح الدین احمد،مولانا: ''صریرِ خامہ (جلد سوم،محمد حسین آزاد)''لاہور،المقبول پبلی کیشنز،س۔ن

ترجمہ شدہ کتب

۱۔ صلاح الدین احمد،مولانا: 'کششِ ثقل''، لاہور،نو بک کمپنی، ۱۳۸۔ انارکلی،س۔ن

۲۔ صلاح الدین احمد،مولانا: ''پرندے''، لاہور، پبلشرز، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،س۔ن

۳۔ صلاح الدین احمد،مولانا: ''سائنس دان اور اس کے آلات''، لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،س ن

۴۔ صلاح الدین احمد،مولانا: ''روشنی''لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،س ن

۵۔ صلاح الدین احمد،مولانا: 'آواز کی بلندی''، لاہور، نیو بک کمپنی، ۱۳۸۔ انارکلی،س۔ن

۶۔ صلاح الدین احمد،مولانا: ''زمین کا پہلا ہمسایہ (چاند)''لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،س ن

۷۔ صلاح الدین احمد،مولانا: 'زندگی منزل بہ منزل'لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،۱۹۶۲ء

۸۔ صلاح الدین احمد،مولانا: 'زمین کی بدلتی ہوئی سطح''، لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،۱۹۶۲ء

۹۔ صلاح الدین احمد،مولانا: ''بادل، بارش اور برف'، لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،۱۹۶۲ء

۱۰۔ صلاح الدین احمد،مولانا: 'مادہ، سالمے اور جوہر''، لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،۱۹۶۲ء

۱۱۔ صلاح الدین احمد،مولانا: 'توہمات یا سائنس''، لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،۱۹۶۲ء

۱۲۔ صلاح الدین احمد،مولانا: 'پودوں کے کارخانے''، لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی،۱۹۶۲ء

۱۳۔ صلاح الدین احمد،مولانا: ''مقناطیس'' (بہ اشتراک مکتبہ فرینکلن ، لاہور) لاہور، نیو بک کمپنی، ۱۳۸۔ انارکلی،۱۹۶۲ء

۱۴۔ صلاح الدین احمد،مولانا: 'انسانی مشین''، لاہور، یونائیٹڈ لمیٹڈ، انارکلی، ۱۹۶۵ء

انگریزی کتب (مولانا صلاح الدین احمد نے جن سے درج بالا کتب ترجمہ کیں)

1- Bertha Morris Parker: "You as a Machine" New York, Row Peterson and Company, 1951.
2- Bertha Morris Parker: "Gravity" New York, Row Peterson and Company, 1954.
3- Bertha Morris Parker: "Magnets" New York, Row Peterson and Company, 1955.
4- Bertha Morris Parker: "The Earth's Nearest Neighbour" New York, Row Peterson and Company, 1956.
5- Bertha Morris Parker: "Clouds, Rain and Snow" New York, Row Peterson and Company, 1957.
6- Bertha Morris Parker: "Birds" New York, Row Peterson and Company, 1958.
7- Bertha Morris Parker: "Plant Factories" New York, Row Peterson and Company, 1957.
8- Bertha Morris Parker: "Matter Molecules and Atoms" New York, Row Peterson and Company, 1959.
9- Bertha Morris Parker: "Sound" New York, Row Peterson and Company, 1959.
10- Bertha Morris Parker: "Life though the Ages" New York, Row Peterson, and Company, 1960.
11- Bertha Morris Parker: "The Earth's Changing Surface", New York, Row Peterson, and Company, 1960.
12- Bertha Morris Parker: "The Scientist and His Tools", New York, Row Peterson and Company, 1960.
13- Bertha Morris Parker: "Light" New York, Ros Peterson and Company, 1960.
14- Bertha Morris Parker: "Superstition or Science, New York, Row Peterson and Company, 1961.

ثانوی مآخذ

اُردو کتب

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اقبال شناسی اور ادبی دُنیا'' لاہور، بزمِ اقبال، کلب روڈ، ۱۹۸۸ء
۲۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''مولانا صلاح الدین احمد (کتابیات)'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۹ء

۳۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''مولانا صلاح الدین احمد ـــ ایک مطالعہ'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات، ۱۹۹۱ء
۴۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات، پاکستان، جنوری ۱۹۹۲ء
۵۔ شیما مجید، مرتب: ''ادبی مذاکرے'' لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۹ء
۶۔ عاتکہ صدیقی: ''مولانا صلاح الدین احمد ـــ شخصیت اور فن'' لاہور کاغذی پیرہن، ۲۰۰۱ء
۷۔ فرحت اللہ بیگ، مرزا: ''مضامین فرحت'' (حصہ دوم) لکھنؤ، عہدِ نو پبلی کیشنز ۱۹۵۸ء
۸۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: ''ہندی اُردو تنازع''، کراچی ۱۹۷۷ء
۹۔ گوپال متل: ''لاہور کا جو ذکر کیا'' دِلّی، مکتبہ تحریر، ۱۹۴۹ء
۱۰۔ محمد حسین آزاد، مولانا: ''اُردو کی پہلی کتاب'' (مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی) کراچی انجمن ترقی اُردو، ۱۹۶۳ء،
۱۱۔ محمود احمد اسیر، ڈاکٹر: ''مولانا صلاح الدین احمد ـــ احوال و آثار'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۹ء
۱۲۔ میرا جی: ''مشرق و مغرب کے نغمے'' لاہور، اکادمی پنجاب، ۱۹۵۸ء
۱۳۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: ''تنقید اور احتساب'' لاہور، جدید ناشرین، ۱۹۶۸ء
۱۴۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: ''خیال پارے'' سرگودھا، مکتبہ اُردو زبان، ۱۹۸۲ء
۱۵۔ وزیر آغا، ڈاکٹر / انور سدید، ڈاکٹر: ''مولانا صلاح الدین ـــ شخصیت اور فن'' کراچی، انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۰ء

انگریزی کتب

1- LHO Garret / Abdul Hameed (Editor): "A History of Govt. College" Lahore, Ripon.

رسائل

۱۔ ادبی دُنیا، مارچ ۱۹۳۴ء، جولائی ۱۹۴۳ء، مارچ ۱۹۴۴ء، اکتوبر ۱۹۴۵ء، دسمبر ۱۹۴۵ء، مارچ ۱۹۴۷ء، مئی ۱۹۴۶ء، اپریل ۱۹۴۶ء، جون ۱۹۴۶ء، اگست ۱۹۴۶ء، ستمبر ۱۹۴۶ء، اکتوبر ۱۹۴۶ء، نومبر ۱۹۴۶ء، فروری ۱۹۴۸ء، نومبر ۱۹۴۹ء، فروری ۱۹۵۱ء، اگست ۱۹۵۵ء
۲۔ اُردو ڈائجسٹ، دسمبر ۱۹۶۱ء
۳۔ شہاب، ۲۸ جون ۱۹۶۴ء
۴۔ فنون، اکتوبر / نومبر ۱۹۶۴ء
۵۔ قومی زبان، جون / جولائی ۱۹۶۴ء
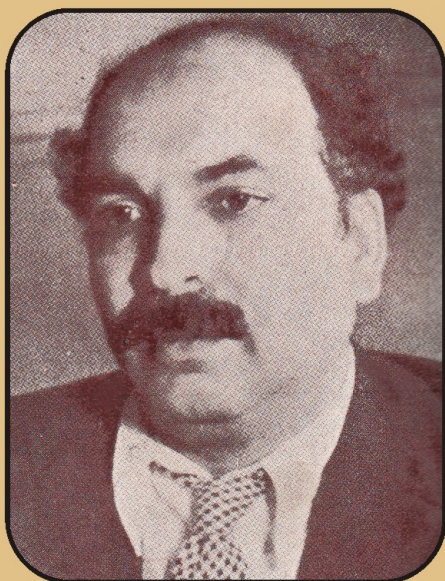
مقتدرہ قومی زبان نے ادارے کے دوسرے اہم وظائف کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی کہ اُردو کے بنیاد گزاروں کو یاد رکھا جانا چاہیے تاکہ آئندہ نسلوں کو اُن کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات سے آگاہ کیا جاسکے۔ مشاہیر اُردو کے عنوان سے پیش نظر سلسلۂ مطبوعات کا آغاز کیا گیا ہے جس میں اُردو کے محسنوں اور بنیاد گزاروں کی اُردو کے لیے خدمات پر تعارفی نوعیت کی مختصر مگر جامع کتابیں شائع کی جائیں گی۔

مولانا صلاح الدین احمد اردو کے ایک معتبر تنقید نگار، عہد ساز مدیر، بہت نمایاں مقام و مرتبے کے حامل مترجم، تبصرہ نگار اور شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ادبی دنیا جیسے ادبی جریدے کے مدیر کی حیثیت سے اردو دنیا میں مولانا صلاح الدین احمد ممتاز اور منفرد مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے مولانا کا اسلوب بالکل جداگانہ اور الگ تشخص کا حامل ہے۔ ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق جیسی تحریکوں سے طویل وابستگی ان کی شخصیت کا ایک بہت ہی نمایاں پہلو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی خدمت کے حوالوں سے مولانا صلاح الدین احمد بے حد اہم ادیب اور دانش ور ہیں۔

ڈاکٹر طارق ہاشمی اردو کے نوجوان محقق، تنقید نگار، شاعر اور استاد ہیں۔ انھوں نے مقتدرہ قومی زبان کے سلسلۂ مطبوعات مشاہیر اردو کے لیے ہماری درخواست پر مولانا صلاح الدین احمد کے احوال و آثار کے حوالے سے بہت اہم کتاب لکھی اور اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔